حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۱۲

جمیل مظہری

پروفیسر کوثر مظہری

Monograph-12

Jameel Mazhari

By : Prof. Kausar Mazhari

جمیل مظہری دنیائے شعر و ادب میں ایک منفرد اور ممتاز شخصیت کا نام ہے۔ ان کے یہاں نثری اور شعری دونوں تخلیقات اپنے کمالِ فن پر پہنچی ہوئی ہیں۔ اُن کی نظمیں، غزلیں، مثنویاں، مرثیے اور قصائد ادب میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمیل مظہری کا شمار ہندستان کے اُن شعراء میں ہوتا ہے جن کا شعر و ادب میں نہایت اعلیٰ و ارفع مقام ہے۔ جمیل مظہری ۴/ستمبر ۱۹۰۴ء کو اپنی نانیہال پٹنہ کے مغل پورا محلّہ میں پیدا ہوئے۔ اسکول ریکارڈ کے مطابق اُن کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۰۵ء ہے، جسے ان کے چھوٹے بھائی سید رضا مظہری نے غلط کہا ہے۔ ان کا اصل نام سید کاظم علی تھا، لیکن یہ علاّمہ جمیل مظہری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا خاندان سادات موسوی تھا۔ امام حضرت موسیٰ کاظم ان کے مورث اعلیٰ تھے۔ اپنے دادا مولانا مظہر حسن کے نام کی نسبت سے مظہری لکھتے تھے۔

جمیل مظہری کے کلام کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایتی انداز کے شاعر نہیں تھے، بلکہ اُن کی شاعری فکری شاعری تھی۔ ان کی شعری تخلیقات ہمیں نیا اندازِ نظر اور دعوتِ فکر دیتی ہیں، لیکن جب ہم اُن کا سنجیدہ اور مربوط مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں منتشر اور ژولیدہ افکار و نظریات ملتے ہیں، جو حسین اور دِلکش تو ضرور ہیں، مگر ان میں مربوط اور منظّم فلسفہ حیات اور نظریۂ زندگی نہیں ملتا ہے، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ شاعر تشکیک اور تشنگیٔ فکر کی منزل سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے، وہ ابھی حیات کائنات کے مضمرات کو سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر ہے۔ مثنوی ''آب و سراب'' کا یہ شعر اس کی تصدیق کرتا ہے۔

افسانہ ہے یہ غرض ہمارا — تشکیک بھی ہے مرض ہمارا

بعض ناقدین انھیں ایک فلسفی شاعر قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک غلط نقطۂ نظر ہے۔ فلسفہ ایک مکمل اور مربوط نظامِ فکر ہے۔ جبکہ جمیل مظہری کی شاعری ژولیدگی منتشر خیالی اور تضادات فکر کا مظہر ہے۔ اُن کے یہاں فکری توانائی تو ہے، مگر فلسفہ نہیں۔ ہم اُنھیں ایک تفکیری شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

اس فردنامے کے مصنف پروفیسر کوثر مظہری اردو کے ایک نقّاد، ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں مشہور اور معتبر ہیں۔ ان کا تعلق بہار کے مشرقی چمپارن کی ایک بستی چندن بارہ سے ہے۔ وہ اِن دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں درس و تدریس کے فرائض بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف سے اُن کا رشتہ بہت گہرا اور حقیقی ہے۔ اُن کی کئی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع ہو کر سند اعتبار حاصل کر چکی ہیں۔ اُن میں سے چند تصنیفات اور تالیفات کے نام مندرجہ ذیل ہے۔

'موج ادب'، 'شکستہ پر'، 'آنکھ جو سوچتی ہے'، 'جواز و انتخاب'، 'جرأت افکار'، 'ماضی کا آئندہ'، 'قرأت اور مکالمہ'، 'ارتسام'، 'باز دید اور تبصرے' وغیرہ۔

جمیل مظہری 'پروفیسر کوثر مظہری' کے ایک پسندیدہ شاعر ہیں۔ انھوں نے 'مظہرِ جمیل' کے عنوان سے اُن پر ایک قابلِ مطالعہ کتاب بھی تالیف کی ہے۔ ان کا یہ فردنامہ جمیل مظہری کی تفہیم میں معاون ہوگا۔

—اسلم جاوداں

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

جمیل مظہری

پروفیسر کوثر مظہری

طابع وناشر:

اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۱۲

Jameel Mazhari

By

Kausar Mazhari

نام کتاب	:	جمیل مظہری
مصنف	:	کوثر مظہری
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	144
کمپوزنگ وتزئین	:	محمد سعید احمد
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔۶

ملنے کا پتہ:

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی۔ بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱

فون نمبر: 0612-2530093، ای میل: directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	پروفیسر کوثر مظہری	6
باب اوّل : جمیل مظہری : ایک نظر میں		8
شخصیت اور ازدواجی زندگی		9
باب دوم: جمیل مظہری کے شعری کارنامے		13
نظم نگاری		14
غزل گوئی		45
مرثیہ نگاری		54
قصیدہ نگاری		62
مثنوی نگاری		68
رباعی گوئی		79
باب سوم: جمیل مظہری کے نثری کارنامے		83
تنقید		84
افسانے		93
طنزیات وفکاہات		100
باب چہارم: انتخاب نگارشات		103
نظمیں		104
غزلیں		121
مرثیہ		129
مثنوی		132
قصیدہ		137
نثر: طوائف کی ضرورت متمدن دنیا میں (فکاہیہ کالم)		142

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری وادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعروادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد،، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری وادبی عظمت واہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری وادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعروادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشوران شعروادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے

بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام آثر، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوقؔ نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراںؔ، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدا بخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخؔ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

جمیل مظہری اردو کے ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے معتبر، مستند اور معروف ہیں۔ انھوں نے غزل گوئی اور نظم نگاری دونوں اصناف میں اپنے قلم کا جوہر دکھایا اور بیش قیمت ادبی سرمایہ چھوڑا۔

ان کے شعری و ادبی سرمائے نے دبستان بہار کے خزانے میں گراں قدر اضافہ کر کے اس کی عظمت کو دوبالا کیا ہے۔ بہار کے اردو ادب کی تاریخ اُن کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔

اس فردنامے کے مصنف پروفیسر کوثر مظہری جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے ایک ناقد، فکشن نگار اور شاعر کی حیثیت سے اپنی ایک علاحدہ شناخت حاصل کی ہے۔ جمیل مظہری سے اُنھیں گہرا ادبی لگاؤ رہا ہے۔ کوثر مظہری کا تصنیف کردہ یہ فردنامہ جمیل مظہری کی شخصیت اور خدمات ادب کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔

امید ہے کہ آپ کو اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیش کش ضرور پسند آئے گی۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

جمیل مظہری اردو شعر و ادب کا ایک نمایاں نام ہے۔ بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے لے کر آٹھویں دہائی کے اواخر تک اُن کا اشہبِ قلم رواں رہا۔ فکری تلاطم خیزی کا وہ عالم کہ اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف، نظم، غزل، مرثیہ، قصیدہ، قطعہ، رباعی میں طبع آزمائی کی۔ طنز و مزاح کے اسلوب کو اپنایا تو اس میں بھی اہم آثار چھوڑے۔ فکاہیہ کالم نویسی شروع کی یا انشائے لطیف کی طرف توجہ کی تو الفاظ و تراکیب کے جواہر لٹائے۔ تنقید و تقریظ میں قلم چلا تو ادب فہمی کے نکتہ ہائے دور رس دیکھنے کو ملے۔ غرض کہ ہر ایک زمرۂ ادب میں ان کا تخلیقی و فکری اختصاص دور سے نظر آتا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار کی طرف سے جب مجھے مونوگراف لکھنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تو یک گونہ مسرت ہوئی۔ میں نے دہلی میں 2012 میں جمیل مظہری پر ایک سمینار منعقد کیا تھا جس کے مضامین چند ماقبل کے ساتھ مظہرِ جمیل کی شکل میں (2014) چھپ چکے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی دہلی کے لیے بھی ایک انتخاب کیا تھا۔ اندازہ یہ ہوا کہ جمیل مظہری جس پایہ کے فنکار تھے، اس کے مطابق ادبی دنیا میں ان کی پذیرائی نہیں ہو سکی۔ ان کے کلام اور نثری نگارشات کی اشاعت تو ہوئی ہے، لیکن متون میں اغلاط دیکھ کر ذہن بدحظ ہو جاتا ہے، خصوصی طور پر کلیات کی اشاعت میں احتیاط کا فقدان نظر آتا ہے۔

زیرِ نظر مونوگراف میں کوشش کی گئی ہے کہ جمیل کی فکری و فنی تعبیر و تفسیر اختصار کے ساتھ ہو سکے۔ دیکھا جائے تو یہ ایک بہت ہی وسیع موضوع ہے۔ انتخاب میں نظمیں، غزلیں تو ہیں ہی، ایک مرثیے کے منتخب بند، ایک پورا قصیدہ، دونوں مشہور مثنویوں 'آب و سراب' اور 'از جہنم' سے منتخب اشعار دیے گئے ہیں۔ طویل مسدس فریاد اور اثر فریاد/ جواب فریاد سے، انتخاب دینا مشکل تھا، اسی طرح رباعیات اور قطعات بھی نہیں آسکے۔ نثری نگارشات میں سے صرف ایک تحریر بطور نمونہ کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے۔ آخر میں اردو ڈائرکٹوریٹ کا سراپا سپاس ہوں کہ مجھے جمیل مظہری جیسے ثقہ شاعر و ادیب پر مونوگراف لکھنے کا موقع عنایت کیا۔

پروفیسر کوثر مظہری
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

باب اوّل

جمیل مظہری : ایک نظر میں

اصل نام	سید کاظم علی
تاریخی نام	میر کاظم علی
قلمی نام	جمیل مظہری
تاریخ پیدائش	ستمبر 1904
والد کا نام	مولانا خورشید حسنین
ابتدائی تعلیم	ضلع اسکول موتیہاری، ضلع اسکول مظفر پور
	مدرسہ عالیہ کلکتہ (کچھ دنوں کے لیے)
	گریجویشن: اسلامیہ کالج، کلکتہ
	ایم اے (فارسی): کلکتہ یونیورسٹی، 1931
شرف تلمذ	حضرت وحشت کلکتوی
ذریعہ کسب معاش	پبلسٹی افسر (اردو) محکمہ نشر و اشاعت، حکومت بہار، 1937
	جوش ملیح آبادی کے مشورے پر فلمی دنیا کا سفر جلد ہی 1945 میں واپسی،
	ڈپٹی ڈائرکٹر پبلسٹی اور فلم سکشن (1947)
	جنوری 1950 میں پٹنہ کالج میں لکچرر
	1960 میں شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے وابستگی،
	1965 میں یو جی سی فیلو
سبکدوشی	1974 میں شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے سبکدوشی
وفات	23 جولائی 1980 رات گیارہ بجے
مدفن	بھیکن پور، مظفر پور (بہار)

شخصیت اور ازدواجی زندگی:

جمیل مظہری ایک باظرف اور نیک خو انسان تھے۔ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ اپنے رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے حاجت مندوں کی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ مظہر امام نے لکھا ہے کہ وہ کان کے کچے تھے اس لیے انھیں دوستوں اور عزیزوں سے بدگمان کرنا کرانا آسان تھا۔ ذہن مفکرانہ اور فلسفیانہ مگر دل حد درجہ جذباتی تھا (جمیل مظہری، مونوگراف، ص 24)۔ وہ گرچہ آزاد طبیعت کے مالک تھے لیکن روپیوں پیسوں کی اہمیت خوب سمجھتے تھے۔ وہ کس درجہ محتاط اور حساس تھے اس کا اندازہ مظہر امام کے اس اقتباس سے ہوتا ہے:

> ''... دوسری طرف ایسا بھی ہوتا کہ وہ دیا سلائی کی تیلیاں گنتے کہ ڈبیا پر چھپی ہوئی تعداد سے کم تو نہیں۔ سگریٹ بجھا بجھا کر پیتے اور ان کے ٹکڑوں پر نگاہ رکھتے کہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ ایک پیسہ بھی حساب میں کم ہو جاتا تو اس کے لیے پہروں ادھیڑ بن میں مبتلا رہتے اور کونوں کھدروں میں تلاش کرتے پھرتے۔ جو شخص اُن کے مزاج سے واقف نہ ہوتا وہ اسے خساست سے تعبیر کرتا۔'' [1]

جمیل مظہری کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنی شاعری سنانے سے احتراز کرتے تھے، بالخصوص مشاعروں سے اجتناب کرتے۔ البتہ، چھوٹی اور مخصوص نشستوں میں شاعری سناتے۔ مشاعروں میں اگر کسی کا کوئی شعر پسند آجاتا تو 'واہ واہ' کرتے رہتے۔ بلکہ وہ شاعر آگے بڑھ جاتا لیکن وہ اسی ایک شعر پر داد دیتے رہتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان پر ایک گمشدگی اور بے خودی کا سا عالم طاری ہو گیا ہے۔ شاگردوں کی شاعری پر اصلاح دیتے تو اصل شاعری سے الگ اپنی شاعری پیش کر دیتے۔ مشہور ہے کہ بہت سے شاگردوں نے اُن کے اشعار سے کافی استفادہ کیا یعنی وہ خود اپنا کلام بھی شاگردوں کو بخش دیا کرتے گویا وہ ہر معاملے میں سخاوت کا مظاہرہ کرتے۔

جمیل مظہری شروع میں تو داڑھی شیو کرتے اور مونچھیں کتر کے رکھا کرتے تھے لیکن عمر کے اواخر میں داڑھی رکھ لی تھی۔ وہ ہلکی چھوٹی داڑھی رکھتے تھے۔ گھر میں کرتا پاجامہ اور باہر جاتے ہوئے شیروانی اور

ٹوپی پہن لیا کرتے تھے۔ انھیں سردی بہت لگتی تھی اس لیے کم سردی میں بھی گرم کپڑے اور مفلر ٹوپی کا استعمال کیا کرتے۔ معمولی درجے کا سگریٹ پیا کرتے تھے۔ سردیوں میں غسل کرنے سے بہت گھبراتے تھے۔ زندگی میں کبھی شراب نہیں پی۔

جمیل مظہری کھانے پینے کے بے حد شوقین تھے۔ اچھی اچھی بوٹیاں خود بھی کھاتے اور مہمانوں کے پلیٹ میں بھی رکھتے۔ ثاقب مظفر پوری نے کسی دعوت کا ذکر کیا ہے جس میں مولانا خورشید حسنین (جمیل مظہری کے والد)، واہب مظفر پوری، سید محمد ایڈوکیٹ، سید معصوم رضا، اور سید وزیر حسین وغیرہ موجود تھے۔ فلسفیانہ اور مذہبی گفتگو دسترخوان پر ہوتی رہی۔ لکھتے ہیں:

> ''لوگوں نے کھانا شروع بھی کر دیا۔ جمیل مظہری بحث میں الجھے رہے۔ ایک چمچہ ہاتھ میں لیا اور بوٹیوں کو ٹٹولنے لگے پھر چمچہ رکھ کر کھانے والے کی پلیٹوں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ مرغ کے سینے کے دو ٹکڑے وزیر حسین کی پلیٹ میں پڑے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی یک بیک بہت سخت اور تیز لہجے میں کہا۔ "What is this" یہ کہہ کر دونوں ٹکڑوں کو اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا... آج بھی ہمارے گھروں میں آپ اگر What is this مانگیں تو آپ کو مرغ کے سینے کا ٹکڑا ملے گا۔'' [2]

جمیل مظہری مذہبی مزاج رکھتے تھے لیکن عبادت گزاری میں دلچسپی کم تھی۔ آخر عمر میں استخارے پر سختی سے کاربند تھے۔ ہر کام کے لیے استخارے پر بھروسہ کرتے۔ اسی کام کے لیے تسبیح رکھتے۔ اگر تسبیح نہ ہوتی تو دیا سلائی کی تیلیوں سے استخارہ کر لیتے۔ حد تو یہ ہوئی کہ اپنی والدہ کے انتقال پر استخارہ منفی آیا تو تجہیز و تکفین میں شرکت نہیں کی۔ تجہیز و تکفین کے بعد تشریف لے گئے۔ کبھی نماز پڑھتے تو قبلہ رو ہونا ضروری نہیں سمجھتے اور جواز یہ ہوتا کہ خدا صرف قبلہ کی طرف نہیں بلکہ ہر طرف ہے۔

مذکورہ باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل مظہری کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور یکسانیت کے بجائے، ایک طرح کی بے چینی اور رنگارنگی تھی۔ موقع محل سے ان کی طبیعت کی یہ نیرنگی بھی سامنے آجایا کرتی تھی۔

جمیل مظہری کی ازدواجی زندگی انتشار کا شکار رہی یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سبب بھی وہ

انتشارِ ذہنی کا شکار رہے۔ ان کا رشتہ اپنی پھوپھی زاد بہن سے طے ہو چکا تھا۔ وہ اُسی زمانے میں کئی برسوں تک پیچش میں مبتلا رہے جس کے سبب وہ بقول مظہر امام اختلاج قلب کا شکار ہو گئے۔ اکثر ایک طرح کی اضطرابی واضطراری کیفیت ان پر طاری رہتی۔ بہت سے اعزّا نے اسے جنون تصور کر لیا اور 24 سال کی عمر میں یہ رشتہ کسی انجام سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ جمیل نے خود کو اس رشتہ سے جذباتی طور پر جوڑ لیا تھا۔ یہ رشتہ ان کے لیے جذبۂ عشق میں مبدل ہو گیا جو ان کی شاعری میں مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا رہا۔ ان کا افسانہ 'فرض کی قربان گاہ پر' (شکست و فتح) نظمیں ڈرو خدا سے ڈرو، یہ کیا ہوا تم کو، کہانی وغیرہ اُسی سانحہ کی یادگار ہیں۔ حالاں کہ خود جمیل صاحب نے اپنی شاعری کے مضامین عشقیہ سے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی ہے:

> ''کم از کم میں نے جتنی بھی عاشقانہ نظمیں لکھی ہیں ان میں کوئی بھی میرے اپنے جذبات کی ترجمان نہیں ہیں۔ کیوں کہ محبت کی نعمتیں کبھی مجھ پر وارد نہیں ہوئیں۔ میری زندگی میں ایک ایسا خلا ہے جس میں دور تک کوئی ستارہ نہیں۔ اس لیے جو نجومی بھی میری جنم پتری بنائے گا وہ بنیادی طور پر غلط ہوگی۔'' [3]

دراصل جمیل اپنی جنم پتری خود ہی غلط بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے انکار سے کچھ نہیں ہوتا کیوں کہ بعض غزلوں اور نظموں میں جو عشق کی انفعالیت ہے وہ ان کے مذکورہ بالا موقف کی تردید کرتی ہے۔

جمیل مظہری نے 'شعر و شاعری' کے عنوان سے ایک مضمون ریڈیو پر پڑھا تھا جس میں اپنی نظم 'ڈرو خدا سے ڈرو' بھی سنائی تھی۔ یہ تحریر کائنات کے جمیل مظہری نمبر (1982) میں شامل ہے۔ انھوں نے نظم سنا کر اور کئی دوسرے اشعار سنا کر اس بات کی تردید کی کہ ان میں پیش ہونے والی واردات ان کی ہے۔ اپنی نظم 'ڈرو خدا سے ڈرو' سنا کر وضاحت کی ہے:

> ''آپ کو سن کر یہ حیرت ہوگی کہ اس نظم کے پیچھے جو واقعہ ہے وہ میرا نہیں۔ میرے ایک عزیز دوست کا ہے جسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو سولہ سترہ سال کی عمر میں ایک ساٹھ سال کے بوڑھے سے بیاہ دی گئی تھی۔'' [4]

جمیل کی شادی نہیں ہوئی، ساتھ ہی دوسرا حادثہ یہ پیش آیا کہ 1932 میں ان کی سگی بہن صابرہ خاتون (چھ برس چھوٹی تھیں) بیوہ ہو گئیں۔ ان کے دو چھوٹے بچے تھے۔ جمیل مظہری بہت جذباتی تھے اس لیے انھوں نے کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے بہن اور ان کے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری سنبھال لی۔ شادی کرنے کے لیے بہت ضد کی گئی آخر کار ماں کے اصرار پر یہ شرط رکھی کہ کسی سن رسیدہ بیوہ سے شادی کروں گا، جس کے کوئی اولاد نہ ہو۔ 1945 میں جب وہ چالیس کے تھے، مٹیا برج، کلکتہ کی ایک ایسی ہی خاتون سے شادی ہو گئی۔ لیکن یہ رشتہ خوشگوار نہیں بن سکا۔ ان کی ذاتی زندگی میں تنہائی اور ناآسودگی جیسی تھی، وہ برقرار رہی۔ 1969 میں بیوی کا انتقال ہو گیا۔ جمیل مظہری اپنی بہن اور ان کے بچوں اور اپنے بھائی رضا مظہری کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے تھے۔

حواشی

1. جمیل مظہری، مونوگراف از مظہر امام، ساہتیہ اکادمی، 1992، ص 24
2. جمیل مظہری کی مثنوی آب و سراب، ترتیب و تدوین: ڈاکٹر ہلال نقوی، ص 80، کراچی، 1989
3. مضمون 'شعر و شاعر'، آہنگ گیا، دسمبر 89، ثم کائنات، ص 41، 1982
4. کلیات جمیل مظہری، جلد چہارم، ص 661

باب دوم

جمیل مظہری کے شعری کارنامے

جمیل مظہری کے شعری کارنامے

نظم نگاری

اگر ہم جمیل مظہری کے تمام شعری سرمائے کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ وہ نظم کے شاعر ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ان کا شعری میلانِ طبع نظم ہی کی طرف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے موضوعاتی نظمیں بہت کہیں اور طویل طویل مرثیے اور قصیدے بھی کہے۔ طویل مثنوی 'آب وسراب' بھی اس پر دال ہے کہ ان کی افتادِ طبع نظم کے عین مطابق تھی۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'نقش جمیل' (1953) میں مکتبۂ ادب، پٹنہ سے شائع ہوا جسے مشہور شاعرِ طنز ومزاح رضا نقوی واہی نے مرتب کیا تھا۔

جب ہم مضامین اور موضوعات کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اصلاً وہ فکر اور فلسفے کے شاعر ہیں۔ ان کے اندر ایک بے چین روح ہے جو ہر گھڑی نئے روپ میں سامنے آتی ہے یا کائنات اور اشیائے کائنات کو نئے روپ میں سامنے لاتی ہے۔ وہ ذرے ذرے میں اضطراب اور حرکت وعمل دیکھنا چاہتے ہیں یا ان کا نظریہ ہے کہ زندگی جمود میں نہیں بلکہ حرکت وعمل میں ہے۔ وہ نظامِ ہستی میں تکمیل کے بجائے تسلسل کے قائل ہیں۔ اگر شوق کامل ہے تو منزل کہیں نہیں ہے۔ اقبال نے بھی حرکت وعمل اور مستقل ارتقاپذیر کائنات کا فلسفہ پیش کیا تھا ؎ کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں۔ جمیل مظہری کی نظم پیام (1929) میں اسی فلسفۂ حرکت وعمل کی عکاسی نظر آتی ہے:

جز سعی دوام اور کیا ہے شاعر کا پیام اور کیا ہے
یعنی اس میکدے کی رونق جز گردشِ جام اور کیا ہے
انسان کا کام اور کیا ہے

کوشش میں ہے رازِ نظمِ ہستی　　جنبش ہے دلیلِ زندگانی
اے ننگِ وجود آدمی زاد　　پانی میں اگر نہ ہو روانی
پانی کو کہے گا کون پانی

آگے چل کر وہ ظاہر کرتے ہیں کہ فضاؤں میں بادل منتشر ہیں، موجیں کروٹ بدل رہی ہیں، ہوائے صحرا سرگرمِ عمل ہیں اور اسی طرح بیج کا ارتقا پذیر ہو کر ایک پودا بن جانا، غنچے کا پھول میں تبدیل ہو جانا، یہ سب عوامل حرکت و عمل ہی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح جو قطرہ تاج میں موتی بن کر چمک رہا ہے یہ سب گویا رازِ ارتقا کی گواہی دیتے ہیں۔ ایک نظم ہے 'تخلیق کے دو رخ — اضطرابِ تخلیق اور انفعالِ تخلیق'۔ اس میں بھی کائنات اور اس کی تخلیق پر تبصرہ ہے جو تخلیقی تسلسل اور پھر نظامِ عالم کے بکھر جانے کا اشاریہ بھی ہے۔ دونوں حصوں سے منتخب اشعار:

مہ پارہ بنے گا مہر پارہ　　ہوگا ہر قطرہ اک ستارہ
پھر اس کا بھی جب شباب ہوگا　　ہر تارہ اک آفتاب ہوگا
تخلیق کا حوصلہ نہ پوچھو　　کب سے ہے یہ سلسلہ نہ پوچھو

ہر نظم میں اختلال دیکھو　　تخلیق کا انفعال دیکھو
گردش میں ہے ماہ و سال دیکھو　　ممکن ہے کہ ختم ہو یہ گردش
ممکن ہے کہ پاش پاش ہو یہ　　بکھرے سارا نظامِ شمسی

اس طرح دیکھیے تو جمیل تخلیق کے تسلسل کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ آفاق کا تیور بدل جائے گا اور کسی لمحہ تزلزل بپا ہوگا اور یہ پورا نظامِ شمسی پاش پاش ہو جائے گا۔ یہ سب کو پتہ ہے کہ یہ کائنات آخر کار ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے گی۔ اس طرح کے خیالات اور خدشات جمیل کی شاعری میں جا بجا ملتے ہیں۔ اس طرح کے تخلیقی وجدان کے دو پہلو ہوتے ہیں یعنی اس نوع کی شاعری میں کبھی خوف اور کبھی عرفان و آگہی کے رموز ملتے ہیں۔

اردو شاعری میں سوال قائم کرنے والے شعرا کم ہی ہوئے ہیں۔ غالب اور اقبال کے یہاں اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ جمیل کے یہاں بھی اس نوع کے سوال ملتے ہیں، ایک طرح کی جستجو ہے۔ ایک ایسی جستجو جس

کی تکمیل ممکن نہیں۔ ایک ایسا سوال جس کا جواب نہیں، ایک ایسی آرزو جو کبھی پوری نہ ہو سکے، ایک ایسا تشکیک کا رویہ جس کا حل ممکن نہیں، کائنات کو دیکھنے کا ایک ایسا زاویہ جو بہت عام نہیں بلکہ خالص فلسفیانہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے مکالمے اور مباحثے کی صورت میں اپنے باطن کو پیش کیا ہے۔ شاعر اور خدا میں جو مکالمہ ہے وہ بھی ان کے اندر پیدا ہونے والے سوالات کو پیش کرتا ہے۔ اپنی نظم 'تلاش' میں اپنے فکری میلان کو انھوں نے تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ یہ ایک پُراثر رواں نظم ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جو جمیل کے باطنی وجود کی گرہوں کو پوری طرح کھولتی ہے لیکن اس کے باوجود شاعر اپنے اندر قید ہی رہتا ہے۔ تینوں حصوں سے کچھ مصرعے ملاحظہ کیجیے:

(2)

تخئیل کی رنگارنگی میں
ہر بانسری ہر سارنگی میں
بے رنگی میں بارنگی میں
ہر وسعت میں ہر تنگی میں
تشکیک میں بھی اوہام میں بھی
تفصیل میں بھی ابہام میں بھی
ہر وحی میں بھی الہام میں بھی
وجدان میں بھی عرفان میں بھی
ہم ڈھونڈ رہے تھے کچھ لیکن
اپنے سے باہر جا نہ سکے
اور اپنے اندر آ نہ سکے

اُن کی ایک اور نظم 'ہم کون ہیں ہم کیا ہیں' بہت اہم ہے۔ یہ نظم بند کی شکل میں ہے لیکن سارے بند کے مصرعے برابر نہیں ہیں، کم بیش ہیں:

اک برگِ خزاں دیدہ　　رد کردۂ گلزارے　　رسوا سرِ بازارے
یا سطح پہ دریا کے　　بہتا ہوا اک تنکا　　جو رحم پہ موجوں کے
ہو گرمِ عمل ہر سو　　جاتا ہو جو بڑھ بڑھ کر　　پابوسیِ ساحل کو

اور جا نہیں سکتا ہو

ہم کون ہیں، ہم کیا ہیں؟

مذکورہ بالا شعری حصوں سے جمیل مظہری کی اضطرابی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت اور خدا کی حقیقت کے مابین ایک تذبذب کی حالت میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ گھوم پھر کر تشکیک کی طرف آجاتے ہیں۔ ان کے تفکراتی رجحان کی نظموں میں یہی رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں قصۂ آدم کی مختلف جہتیں بھی ملتی ہیں۔ انسانی تہذیب کی خامیوں اور انتشار کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگر غور کریں تو ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے ہمہ گیر تجربات ومشاہدات کی کرنیں ضوپاشیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظموں پیام، میں اور تو، دواندھیرے، اپنا تعارف، پندارحکیمانہ، آدم نو کا ترانۂ سفر اور فسانۂ آدم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فلسفہ طرازی میں ایک تخلیقی آنچ ہے جو آدم کی ارتقا پذیری اور شعور آفرینی کو حدت عطا کر رہی ہے۔ پرواز تخیل نے شاعر کو قصۂ آدم کا ادراک عطا کیا ہے:

یہ مہرتاباں سے کوئی کہہ دے کہ اپنی کرنوں کو گن کے رکھ لے
میں اپنے صحرا کے ذرے ذرے کو خود چمکنا سکھا رہا ہوں
مرا تخیل، مرے ارادے کریں گے فطرت پہ حکمرانی
جہاں فرشتوں کے پر ہیں لرزاں میں اُس بلندی پہ جا رہا ہوں

(آدم نو کا ترانۂ سفر 1934: نقش جمیل)

جمیل مظہری نے 'فسانۂ آدم' میں انسان کے وجود میں آکر دنیا میں آنے سے لے کر مختلف مراحل سے گزرنے تک کے احوال کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔

اسی طرح نظم 'ارتقا' میں جہاں امکان اور جذبات وافکار کی ارتقا پذیری کا ذکر ہوا ہے، ایک اہم حوالہ ہے جمیل مظہری کے تخلیقی وجدان کا۔ نظم ارتقا سے ایک بند ملاحظہ کیجیے:

ہر حال میں مشیت مجھ کو بنا رہی ہے میں اس کی قدرتوں کا شہکار بن رہا ہوں
خود اپنی جنتوں کی تخلیق کررہا ہوں خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں
یہ جبر و قدر کی اک منزل ہے درمیانی مجبور تو ہوں لیکن مختار بن رہا ہوں
یہ راہ وہ ہے جس میں ہر سانس اک سفر ہے

منزل بھی راستہ ہے، لغزش بھی راہبر ہے

جمیل نے فکری تموّج کے باوجود اپنی شعری تنظیم وتہذیب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں تخلیقی وفور کی روانی محسوس ہوتی ہے۔ شاعری جمیل کے لیے روح کی کیفیت کا نام ہے۔ جمیل کی شاعری میں عشق آتا ہے لیکن اس پر عقل حاوی ہوجاتی ہے۔ عقلیت اور نیچر پرستی نے جمیل کے فن کو توہم اور تشکیک کا شکار بنا دیا تھا۔ ان کی نظم ''ہم کون ہیں ہم کیا ہیں؟'' میں ان کے فکری تذبذب کو دیکھا جاسکتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس نظم میں جمیل کی تخلیقی روانی دیکھی جاسکتی ہے، ساتھ ہی آدمی کی شناخت پر ایک استفہامیہ نگاہ بھی ڈالی گئی ہے۔

یہ جو تشکّک اور تذبذب ہے وہ جذبات انسانی کے وفور اور تجربات ومشاہدات کے مابین ہونے والی کشمکش سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ جمیل اگر منکر خدا یا مذہب کے منکر ہوتے تو اس درجہ تذبذب یا تشکیک کی صورت ہی پیدا نہ ہوتی۔ منکر تو انکار کرکے پرسکون اور مطمئن ہوجاتا ہے۔ جمیل نے دوسرے لوگوں کو یہ کہہ کر سوچنے پر مجبور بھی کردیا ہے:

سارے مرے جھگڑے ہیں جمیل اپنے خدا سے
منکر میں ائمہ کا نہ منکر میں نبیؐ کا

اوپر جمیل مظہری کی نظم 'ارتقا' سے ایک بند پیش کیا گیا ہے جس میں انھوں نے انسانی عظمت کی ایک نئی تعبیر پیش کی ہے۔ جمیل خود ہی اپنی جنتوں کی تخلیق کررہے ہیں اور اپنی زندگی کے مختار بھی بن رہے ہیں۔ وہ جبر وقدر کو درمیانی منزل تصور کرتے ہیں اور مجبور ہونے کے باوجود خود کو مختار بنا رہے ہیں۔ تحت شعور میں جو قوتیں تھیں اب وہ گہوارۂ خودی میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ انھوں نے اس کا ذکر خیر وشر کے حوالے سے اس طرح کیا ہے:

پکڑے ہوئے ہیں دامن گو خیر و شر ہمارا پابندیوں میں بھی ہے جاری سفر ہمارا
گمراہیوں سے ہوکر ہے راستہ ہمارا تاریخ بن رہا ہے ہر نقش پا ہمارا

(ارتقا، 1944: نقش جمیل)

جمیل مظہری نے اپنے ایسے بہت سے خیالات کا اظہار اپنی نثری تحریروں میں بھی کیا ہے۔ ایک مضمون ہے، ایک خیال، جس میں انسانی عقیدے اور اس کے عمل کو اس طرح شک کی نظر سے دیکھا ہے:

تمہارا سب سے بڑا گناہ تمہارا یہی عقیدہ ہے کہ اس پیدا کرنے والے نے تمھیں اپنی پوجا کے لیے پیدا کیا ہے۔ نہیں، اس نے تمھیں غلامی کے لیے نہیں اپنی نیابت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ عادت قبیح تمہاری تم سے اس کی نیابت نہیں چاکری کروا رہی ہے، خالقیت نہیں مخلوقیت سکھا رہی ہے۔''

نیابت الٰہی کی بات علامہ اقبال نے بھی کی لیکن وہاں تشکیک کے بجائے ایقان کی شمع فروزاں ہے، ایک واضح اور منظّم فلسفۂ حیات ہے جس کے نتیجے میں وہ یہ کہنے میں حق بجانب نظر آتے ہیں کہ:

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں   غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود   گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

اقبال کو معلوم ہے کہ مجاہدے اور عبادتوں کے بعد انسان بھی مولا صفات ہو جاتا ہے اس لیے وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کارکشا کارساز

جمیل کی شاعری میں جو مابعد الطبعیاتی (Metaphysical) صورتیں نظر آتی ہیں اور جو لہجہ نظر آتا ہے اس میں بانکپن اور نکیلا پن تو ہے، لیکن فکری کجی کے سبب کوئی واضح اور شفاف نظریۂ حیات قائم ہوتا نظر نہیں آتا۔ اگر اسے منفی طور پر دیکھیں تو اس نوع کی شاعری میں صرف منفی رویے نظر آئیں گے اور اگر مثبت انداز میں غور کریں تو اس میں زندگی کے مثبت رویے دکھائی دیں گے۔ عظمت آدم اور حرکت و عمل اقبال کے بھی اہم موضوعات رہے ہیں۔ لیکن اقبال نے تمام فلسفوں کی چھان پھٹک کرنے کے بعد تصور خودی کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا۔ یہاں خلیل الرحمٰن اعظمی کا موقف ملاحظہ کیجیے:

''جمیل مظہری نے اقبال کے اس تصور کو بہت احتیاط سے اپنایا ہے اور اس میں سے وہی چیزیں لی ہیں جو ان کے نزدیک معتبر اور صحت مند ہیں یعنی حرکت و حیات اور انسانی عظمت کو عمومی طور پر اپنا مرکز نگاہ بنایا ہے، لیکن مرد مومن، فوق البشر اور فلسفہ شاہین سے وہ دامن

بچا کر نکل گئے ہیں۔''[1]

اس عظمت آدم کے قصے جمیل مظہری کی نظموں آدم نو کا ترانۂ سفر، فسانۂ آدم، میں اور تو وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ حرکت و عمل کے حوالے سے 'پیام' کے اشعار پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے جن سے عظمت آدم اور حرکت و عمل دونوں کی شناخت ہوتی ہے:

یہ انقلاب طبیعت مزاج آہن کو   ہوا کی گرمیٔ پرواز بخش دی میں نے
بلندیوں کا تصور بھی رہ گیا پیچھے   پہنچ کے اتنی بلندی پہ سانس لی میں نے

(ماخوذ: فسانۂ آدم)

طلسم فطرت بھی مسکراتا ہے میری افسوں طرازیوں پر
بہت سے جادو جگا چکا ہوں، بہت سے جادو جگا رہا ہوں
مرا تخیل، مرے ارادے کریں گے فطرت پہ حکمرانی
جہاں فرشتوں کے پر ہیں لرزاں میں اس بلندی پہ جا رہا ہوں
یہ وہ گھروندے ہیں جن پہ اک دن پڑے گی بنیادِ قصرِ جنت
نہ سمجھیں سُکّانِ بزمِ عصمت کہ میں گھروندے بنا رہا ہوں

(ماخوذ: آدم نو کا ترانۂ سفر)

عقل مری اٹھا چکی رسم پرستشِ قیود
اور ترا دماغ ہے بت کدۂ مشاہدات
عالم شور و شر میں ہے تجھ سے سکون موت کا
خواب گہہِ جمود میں مجھ سے تلاطمِ حیات

(ماخوذ: میں اور تو)

تشکیک و تذبذب کے حوالے سے اور بھی باتیں ہو سکتی ہیں لیکن چوں کہ اور بھی اہم موضوعات ہیں اس لیے اس زاویہ مضمون کو یہیں موقوف کیا جاتا ہے۔ ان کی ایک خوبصورت اور مشہور نظم 'شاعر کی تمنا' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جمیل نے اس میں دنیا میں انسان کے آنے کے مقصد کو بہت ہی واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نظم میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پوری انسانیت شعری پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے

جیسے یہ نظم درد کا درماں بن کر اور غم واندوہ سے لبریز سینوں کے لیے مسرت کی کرنیں لے کر اترتی ہے۔اس میں چودہ (14) اشعار ہیں۔ یہ پوری نظم انسانی تہذیب کو آئینہ بھی دکھاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک شاعر کی تمنا انسانی زندگی کا واضح مقصد بن کر مجسم (Personified) ہوگئی ہے۔ یہ نظم ایک طرح کی تجسیم اور پیکر تراشی کا تخلیقی نشان بھی بن گئی ہے۔ پوری نظم پر اثر اور دل چسپ ہے لیکن یہاں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اگر اس گلشنِ ہستی میں ہونا ہی مقدر تھا   تو میں غنچوں کی مٹّھی میں دلِ بُلبُل ہوا ہوتا
ہوا ہوتا کسی دستارِ کج پر پھول کا طرّہ   اور اس دستارِ کج کی تمکنت پر ہنس رہا ہوتا
کسی مغرور کی گردن پہ ہوتا بوجھ احساں کا   کسی ظالم کے دل میں درد ہوکر لا دوا ہوتا
کسی بھٹکے ہوئے راہی کو دیتا دعوت منزل   بیاباں کی اندھیری شب میں جوگی کا دیا ہوتا
کسی کے کلبۂ احزاں میں شمع مضمحل بن کر   کسی بیمار مفلس کے سرہانے رو رہا ہوتا
شرر بن کر کسی نادار گھر کے سرد چولھے میں   بصد 'امید فردا' زیرِ خاکستر دبا ہوتا
شکستہ جھونپڑے میں بانسری دہقان کی بن کر   سکوتِ نیم شب میں رازِ ہستی کہہ رہا ہوتا
غرض اس حسرت و اندوہ و یاس و غم کی بستی میں   کہیں درد آفریں ہوتا کہیں درد آشنا ہوتا

اگر غور کیجیے تو ترقی پسند تحریک کی پوری شاعری کا نچوڑ بھی اس نظم میں آ گیا ہے۔خوبی یہ ہے کہ اپنی تمناؤں کو جمیل نے بہت زیادہ Loud ہونے سے بچالیا ہے اور اسی لیے اس میں نغمگی اور شعریت کی ساری خوبیاں نظر آتی ہیں۔ دستار کج کی تمکنت پر ہنسنا، مغرور کی گردن پر بار احسان بننا، ظالم کے دل کے لیے درد لا دوا، کلبۂ احزاں میں بیمار مفلس کے سرہانے شمع مضمحل کی مانند رونا، نادار گھر کے چولھے میں چنگاری بن کر اس کی خاکستر میں 'امید فردا' کی مانند چھپے ہونا، ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں کسان کی بانسری بن کر رات کی خاموشی میں رازِ ہستی سنانا اور آخر میں یہ کہ اس حسرت و یاس کی بستی میں کہیں درد آفریں تو کہیں درد آشنا ہونا— یہ ساری تمنائیں ہیں جو ایک شاعر کی ہیں۔ پھر یہ کہ اپنی تمناؤں کو جن خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں میں ملبوس کیا ہے، وہ اور بھی ان کی تخلیقی ہنرمندی کو فزوں تر کر دیتی ہے۔ ہمارے معاشرے کا کون شخص ہوگا جو اس تمنا میں شریک ہونا پسند نہیں کرے گا؟ ایسی ہی شاعری آفاقی نوعیت کی ہوتی ہے۔ایسی شاعری پر باتیں کم ہوئی ہیں اور جمیل کے تشکیک اور تذبذب پر بحثیں زیادہ ہوتی رہی ہیں۔

اس کے علاوہ انھوں نے 'تول اپنے کو تول' اور 'بھوک' جیسی نظمیں بھی کہیں۔ تول اپنے کو تول میں انھوں نے فنکار کی ذلت آمیز زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ جمیل مظہری فلمی دنیا میں جوش کے بلانے پر چلے گئے تھے لیکن بہت جلد واپس بھی آ گئے۔ اس نظم میں انھوں نے وہاں کے تجربوں کو پیش کیا ہے۔ یہ نظم اٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ دو بند یہاں بطور نمونہ کے پیش کیے جاتے ہیں:

جلنا، جل کے روشنی دینا تھی تیری تقدیر
تو نے خود ہی تاجر بن کر، کی اپنی تحقیر
کس قیمت پر بیچے گا تو نالوں کی تاثیر
کیا ہیں یہ چاندی کے سکّے تیرے من کا مول-تول اپنے کو تول

یہ گیسو یہ بکھرے گیسو ناگ ہیں کالے ناگ
ان ترچھی ترچھی نظروں کو لاگ ہے تجھ سے لاگ
روپ کی اس سندرنگری سے بھاگ رے شاعر بھاگ
تجھ سے تجھ کو چھین رہے ہیں یہ پریوں کے غول-تول اپنے کو تول

جمیل مظہری اگر فلمی دنیا کی چمک دمک کے اسیر ہوگئے ہوتے تو شاید یہ نظم نہیں ہو پاتی۔ اس نظم سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ جمیل مظہری کے اندر ایک خالص اور سچے فنکار کا دل تھا۔ ان کے اندر انانیت تھی۔ وہ ضمیر فروشی کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ وہ تو اپنی نظمیں اور شاعری سنا کر دوستوں سے تعریف و توصیف سننے کو بھی بہت اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ دنیا کی مایا اور یہاں کے کرّ وفر سے ان کے مزاج کو کوئی علاقہ نہیں تھا۔ خواہشات اور خودداری میں ان کے اندر ہمیشہ تصادم رہا کرتا تھا۔ مذہب اور عقیدے کی بات ہو یا دنیا میں خودداری اور روشن ضمیری کی، وہ ہر لحہ گویا کشمکش اور تصادم سے دوچار تھے۔ کبھی سراپا جستجو تو کبھی سراپا سوال، کبھی حضورِ ایزد متعال میں اپنی حاضری پیش کرتے ہوئے تو کبھی درِ الٰہی سے سرکشی کرتے ہوئے۔ کبھی یہ سوال کہ آخر ہم کہاں جائیں، کبھی یہ کہ ایک ہی دل سے دو طرح کی آوازیں آتی ہوئی، یہ سب جو فکری جہتیں اور نیرنگئ شعورِ انسانی ہے، اُس سے جمیل کی بے بسی اور معصومیت بھی سامنے آتی ہے۔ تمنائے دوئی (عکس جمیل) میں انھوں نے آدمی کے پیدا کیے جانے کے مقصد کو بیان کیا ہے اور لب لباب یہ ہے کہ خدا نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے انسان کو پیدا کیا۔ اس نے اپنے جیسی اوصاف والی مخلوق پیدا کی لیکن

یہ ممکن نہیں تھا، کہ مخلوق تو مخلوق ہی ہوگی خالق نہیں ہوسکتی۔ خدا نے گویا جس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا وہ پورا نہ ہوسکا یعنی خدا یکتا و تنہا تھا اور یکتا و تنہا ہی رہا، ہر آدمی بس اپنا ہی رہا، خدا کا نہ ہوسکا۔ جمیل نے انسان کے پیدا کیے جانے کا مقصد ہی غلط بیان کیا ہے۔ اگر ان کے سامنے یہ آیت کریمہ ہوتی: و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون تو وہ مقصد بیان نہ کرتے جو اس نظم میں ہوا ہے۔ یہ نظم بہت ہی رواں اور سبک ہے اور چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ تین حصوں سے کچھ ٹکڑے دیکھیے:

بے مثل بے ہمتا خدا　　تنہا خدا یکتا خدا　　تنہائی سے اکتا گیا　　اکتا گیا گھبرا گیا
چاہا کہ اس تنہائی میں　　ایسا کوئی دمساز ہو　　جس میں نیاز و ناز ہو　　ہمدرد ہو ہمراز ہو
نوری ہو ارضی بھی ہو　　جو صاحب مرضی بھی ہو　　تخلیق پھر تخلیق ہے　　خالق نما کیوں کر بنے
اک لہر اُٹھی خاک سے　　ٹپکا جو نور افلاک سے　　ذروں کو جوش آنے لگا　　مٹی کو ہوش آنے لگا
کہتا ہوں سچی بات میں　　شاعر ہوں دیوانہ نہیں　　اس کا نہ کوئی ہوسکا　　ہر آدمی اپنا رہا
سپنا جو تھا سپنا رہا　　یکتا تھا وہ یکتا رہا　　تنہا تھا وہ تنہا رہا

ایسا لگتا ہے کہ جمیل مظہری نے فلسفہ اوڑھا نہیں ہے بلکہ یہ قطعی ان کے باطن سے پھوٹا ہے۔ ان کے اندرون میں جو ایک طرح کی اضطرابی کیفیت ہے وہ خارج کی زائیدہ نہیں ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے خارجی عوامل کو بصورتِ سیال پی لیا ہے جس سے ان کے باطنی احساس میں ہلچل سی پیدا ہوگئی ہے۔ پوری کائنات کو وہ حیرت اور استفہامیہ انداز میں دیکھتے ہیں۔ جناب ارشد کاکوی نے ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جمیل کی شاعری بڑی حد تک فلسفیانہ سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ کتابی فلسفہ نہیں۔ تفکر برائے تفکر نہیں۔ یہ فلسفہ زائیدۂ احساس ہے۔ اس کا تعلق تجربات حیات سے ہے۔ شاعر کی جبین احساس سنگ حیات سے ٹکرائی ہے۔ اور یہ اشعار نہیں بلکہ رگ احساس سے رِستا ہوا لہو ہے۔'' 2

یوں بھی دیکھا جائے تو تشکیک اور الحاد کے موضوع سے اردو شاعری پہلے بھی اور جمیل کے عہد میں بھی پاک نہیں رہی ہے۔ مذہب بیزاری عوامل کے حصار میں جوش، ساحر، جاں نثار اختر، ن م راشد،

مخدوم، مجاز، محمد علوی وغیرہ بھی رہے ہیں۔ مثالیں بہت سی دی جاسکتی ہیں لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ اس رویے سے اکتا کر آل احمد سرور یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ:

''اکثر رسالوں میں ایسی نظمیں دیکھنے میں آتی ہیں جن میں خدا کے ساتھ شوخی ملتی ہے یا مادیت کی تبلیغ کی جاتی ہے یا مذہبی قدروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے یا اخلاق کے نظام کو آگ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔'' 3

جمیل مظہری نے خدا سے جھگڑنے اور اعراض کی باتیں بھی کہی ہیں لیکن الحاد کی منزل سے پھر بھی اپنے آپ کو دور رکھا ہے۔ ان کے یہاں نور و ظلمت، واہمہ اور یقین، جہل و آگہی، عقل اور عشق کے مابین ایک طرح کا تصادم و تقابل نظر آتا ہے۔ 'مکالمے اور مباحثے' میں صوفی اور شاعر کے درمیان مکالمہ ہے۔ اسی طرح نظم 'شاعر اور خدا' میں بھی مکالمہ ہے۔ ایک دل کی دو آوازیں اور 'جائیں کہاں ہم' میں بھی مکالمے کا سا انداز ملتا ہے۔ نظم 'میں خدا کے حضور میں' پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہرحال اپنے باطن کی آلائشوں کے تزکیے کی دُھن میں ہیں۔ انھوں نے خدا کو ایک باپ کی طرح سمجھنے کی بات بھی کی ہے جس سے تثلیثی نظریے کا نکتہ بھی ابھرتا ہے۔ دیر و حرم یا کلیسا میں جو طرز عبادت ہے اُس پر جمیل معترض ہیں۔ نظم 'مکالمے اور مباحثے' میں صوفی اور شاعر کے مابین مکالمہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ نظم دل چسپ بھی ہے اور بتخانے اور خدا کے تصور پر سوالیہ نشان بھی قائم کرتی ہے۔ نظم 'اب آنکھ کھلی ہے مظہری کی' میں جمیل کی آنکھ وقت کے طمانچے سے کھلتی ہے۔ آگہی کا نشہ تھا اور یقین کی روشنی اندھی تھی، جذبہ و شعور دونوں پیاسے تھے۔ اب جو معنی کا حجاب اٹھ رہا ہے تو لفظوں کے طلسم ٹوٹنے لگے ہیں اور دانش (Intellect) کا فریب کھل رہا ہے۔ یہ سب دیکھ کر مظہری حیران ہیں۔ شاعری گرچہ جگر کا خون تھی، مگر یہ بھی جنون ہی کی ایک شکل تھی۔ اب گویا ساری قدریں دم توڑ رہی ہیں یعنی یہ شورش آب و گل غلط اور بے معنی ہے:

بھرپور تھا وقت کا طمانچہ　　اب آنکھ کھلی ہے مظہری کی
جب گرم ہوئے ہوا کے جھونکے　　سورج نے چبھوئے اپنے نیزے
تب آنکھ کھلی ہے مظہری کی
حالت ہے مگر غنودگی کی

معنی کا حجاب اٹھ رہا ہے　　لفظوں کے طلسم ٹوٹتے ہیں
چہروں سے نقاب اتر رہی ہے　　آنکھوں کے غبار ڈھل رہے ہیں
ماضی کے خمار ڈُھل رہے ہیں　　دانش کے فریب کھل رہے ہیں
اور مظہری اپنی آنکھ کھولے
حیراں ان سب کو تک رہے ہیں
مجذوب کی طرح بک رہے ہیں

(ماخوذ از اب آنکھ کھلی ہے مظہری کی: عکس جمیل)

اب کھلا یہ کہ تماشائے نظر کچھ بھی نہیں　　رنگ و بو کچھ بھی نہیں برق و شرر کچھ بھی نہیں
ظلمت و نور کی ہر شعبدگی جھوٹی تھی　　حلقۂ معتبر شام و سحر کچھ بھی نہیں
عرصۂ جہد میں ٹھہرے تھے کہ بھاگے تھے ہم
حرکتیں خواب کی تھیں خواب میں جاگے تھے ہم

(گور رسیدہ: عکس جمیل)

آگے چل کر اس کتاب 'عکس جمیل' میں نظم 'رخصت' ہے جس پر یہ نوٹ ہے:

''اس نظم میں ایک بوڑھا شاعر دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنی محرومیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ اس لیے آپ اس کو اعتراف شکست بھی کہہ سکتے ہیں اور شکست کی آواز بھی۔''

یہ نظم واقعی جمیل کی پوری زندگی کے اعمال و افعال کا ایک طرح سے اعتراف نامہ (Confession) ہے، جس میں پشیمانی کے نقوش واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک ایسا شاعر جو کائنات اور اشیائے کائنات اور ذات مطلق اور قدسیوں سے برسرِ پیکار رہا کرتا تھا، اب جیسے اس کے اندر ایک طرح کی سپر اندازی کی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ سپر اندازی ہزیمت خوردگی کی نشانی سے زیادہ ایک سمت میں ایک طرح کی فتح ہوتی ہے۔ یہ نظم 14 بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے کچھ حصے پیش کیے جاتے ہیں:

شعور کو کفن اخلاق کا پہنائے ہوئے
بدوش فرض محبت کی لاش اٹھائے ہوئے

لحد میں دل کی تمناؤں کو سلائے ہوئے
جنوں کو عقل کا دیتا ہوا وقار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا
نزاعِ مستقل عقل و دیں سے اکتا کر
جدالِ پیہم زُہد و ہوس سے گھبرا کر
شکست دے کے خودی کو شکست کھا کھا کر
شکست و فتح کی سنتا ہوا پکار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا
نہ شاعری سے ملا کچھ نہ فلسفے سے ملا
نہ میکدے سے ملا کچھ نہ مدرسے سے ملا
نہ ایک داغ جبیں بھی صنم کدے سے ملا
طرب کدوں سے بھی بے کیف و بے خمار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا

جمیل مظہری کی شاعری میں یاس و محرومی کے جذبات کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی تنہائی تھی۔ اگر وہ بھرے پُرے گھر کے ساتھ زندگی گزارتے تو شاید شاعری کا رُخ کچھ دوسرا ہوتا۔ ان کی یاس زدہ طبیعت کا اندازہ ان شعروں سے ہوتا ہے:

مظہری دیکھی نہ جس نے چشم لطف　　مظہری جو پیار کا بھوکا رہا
اس کی محرومی نہ پوچھو جس کا دل　　زندگی بھر بھیک کا پیالہ رہا
کڑھ سکا نہ کوئی اس کے واسطے　　اور وہ سب کے لیے کڑھتا رہا
ایک گلشن تھا نہ سونگھے جس نے پھول　　ایک دریا تھا جو خود پیاسا رہا

(پیاسا دریا: عکسِ جمیل)

فکری نظموں میں اس نوع کی بہت سی نظمیں ہیں جہاں عقل و عشق اور نور و ظلمت، جہل و آگہی کا تصادم بھی ہے اور ان کے درمیان ایک طرح کی کشمکش بھی۔ انسانی جذبات اور احساسات کو جس طرح

سے انھوں نے پیش کیا ہے، ان میں کہیں یاسیت و محرومی کے جلوے ہیں تو کہیں ہلکی سی امید کی کرن ہے۔ مسافر، مجنوں اور ذرات، نوائے تلخ، اب تک، تقدیر جہاں، احتساب، تلاش، بیکسی عقل، عریانی، مریض محبت، دو اندھیرے، سفر، سکوت و حجاب ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں ان کے فکری نظام کی تہہ در تہہ اضطرابی کیفیتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ ساری نظمیں 'عکس جمیل' کی ہیں۔

جمیل مظہری کے فکر اور فلسفے کے حوالے سے اور بھی باتیں ہوسکتی ہیں لیکن یہاں اس کی گنجائش کم ہے۔ **اب رومانیات و شبابیات** کے حوالے سے اور حسن و عشق کے حوالے سے ان کی نظموں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں طرح کی شاعری کا مرجع و منبع ایک ہی ہے۔ ان کے یہاں جو افسردگی، مایوسی اور اضطرابی کیفیت ہے اس کے پیچھے ان کی ناکام زندگی، بالخصوص محبت میں اور نجی زندگی میں ان کی ناکامی رہی ہے۔ بلکہ علیم اللہ حالی نے تو یہ تک لکھا ہے کہ:

''نامساعد حالات اور محبت میں شکست کے احساس سے بچنے کے لیے فکر و فلسفہ ان کے یہاں ایک Defence Mechanism کا کام کرتے ہیں۔''[4]

حالی صاحب کے موقف کی توثیق میں جمیل مظہری کی نظم 'عشق ناتمام' کا یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے:

دل اپنی آگ سے نئے شرر نکالتے رہے
ہم اس پہ اپنے فلسفوں کی راکھ ڈالتے رہے

اگر بغور دیکھیں تو جمیل نے خود ہی اقرار کرلیا ہے۔ لہٰذا، ایک حد تک حالؔی صاحب کا موقف درست بھی ہے لیکن اسے بالکلیہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ اکثر و بیشتر رومانی اور منظری شاعری میں بھی گہرے فکر و فلسفہ کے رموز نظر آجاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر فکر و فلسفہ ہی کے شاعر ہیں۔ لیکن چوں کہ وہ بھی ایک انسان ہیں اس لیے ان کا دل بھی محبت میں دکھا ہے، انھوں نے بھی عشق میں چوٹ کھائی ہے، انھوں نے بھی عذرا اور سلمٰی سے محبت کرکے اپنے جذبات کو ریزہ ریزہ ہونے دیا ہے۔ نقش جمیل کی نالۂ سحر، دوشیزۂ بنگال، نقوش ماضی، حسینوں کی عید وغیرہ نظمیں پڑھ کر ان کی قوت منظرکشی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی حسن و عشق کے مضامین میں ان کی دل چسپی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ منظرکشی رومانی شاعری کے لیے ایک اہم جز بھی ہے۔ رومانی شاعری کے لیے جن عناصر اور عوامل کی ضرورت ہوتی ہے، وہ جمیل کے یہاں موجود ہیں:

اہل مسجد کی نہیں دیر نشینوں کی ہے عید   یعنی عشاق کی ہے عید حسینوں کی ہے عید
سامنے آئینہ ہے محو خود آرائی ہیں   خود تماشا بھی ہیں اور خود ہی تماشائی ہیں
دل ہے آئینے کا اور مشق ادا عید کے دن   زلفِ پُر پیچ ہے شانے سے خفا عید کے دن
عید اور عید کے دن شوخیٔ گفتار کا لطف   کیوں نہ ہو خندۂ انکار میں اقرار کا لطف

(حسینوں کی عید، 1933: نقشِ جمیل)

جمیل کی نظم 'کہتے ہیں کیا اسی کو محبت' (1939) حسن و عشق کی داستاں پر ایک تبصرہ ہے۔ ہر بند میں ایک منفرد، احساس کی پیش کش کے بعد سوالیہ مصرع آتا ہے: کہتے ہیں اسی کو کیا محبت۔'' ایک نظم 'کہانی' (1940) کے عنوان سے ہے جس میں Flash Back کی تکنیک اپنائی گئی ہے۔ یہ نظم 30 شعروں پر مشتمل ہے۔ چند اشعار دیکھتے چلیں تاکہ جمیل کا رومانی انداز سمجھ میں آسکے:

ہے ابھی چشم تصور میں وہ گھر کا آنگن   اور اس آنگن کا وہ اک چھوٹی سی دنیا ہونا
وہ لڑکپن کے گھروندے میں جوانی کا کھیل   اور اس کھیل کا اک فتنۂ فردا ہونا
دفعتاً قلزمِ جذبات میں طوفان شباب   دفعتاً کشتیٔ دل کا تہہ و بالا ہونا
تیرے ہر ناز کا پردے میں حیا کے چھپنا   میرے ہر شوق کا گستاخ تقاضا ہونا
اف ترا پھولوں میں تلنا وہ سہاگن بن کر   میرے گلزارِ تخیل کا وہ صحرا ہونا

نظم 'کہتے ہیں اسی کو کیا محبت' میں پندرہ بند ہیں۔ صرف تین بند ملاحظہ کیجیے تاکہ ان کے لطیف جذبات کی عکاسی ہوسکے:

روٹھی روٹھی ادا میں شوخی
شوخی میں حیا، حیا میں شوخی
معصوم نظر میں اک شرارت — کہتے ہیں اسی کو کیا محبت
سینے میں اک آگ سی لگی ہے
اک ہوک سی دل میں اٹھ رہی ہے
اک درد ہے اور اس میں لذت — کہتے ہیں اسی کو کیا محبت
تم پاس ہو اور سکوں نہیں ہے

یہ کیا ہے اگر جنوں نہیں ہے
لعنت مجھ پہ خدا کی لعنت — کہتے ہیں اسی کو کیا محبت

جمیل کا عشق افلاطونی نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے حقیقی کردار کا عشق ہے۔ جو کسک 'کہتے ہیں کیا اسی کو محبت' میں دکھائی دیتی ہے وہ ارتقا پذیر ہوتی ہوئی 'کہانی' اور پھر اعتراف (1940) 'یہ کیا ہوا تم کو' تک ان کے احساس لطیف کو واشگاف کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ ان کا دل ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہے۔ ''فرض کی قربان گاہ پر'' (بعد میں جسے شکست و فتح سے موسوم کیا گیا) میں ان کے عشق کے پس منظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جمیل کی محبوبہ معاشرے کے جبر کا شکار ہوتی ہے اور اس کی شادی کسی دوسرے شخص سے ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے ان گنت واقعات ملتے ہیں لیکن عاشق اپنے احساس کو ملفوظ و منظوم نہیں کر پاتا۔ اس نظم میں شکایت ہے لیکن کرب کی تصویر کس طرح غیر مجرد ہو کر سامنے آتی ہے، دیکھیے:

یہ کیا ہوا مری عذرا، یہ کیا ہوا تم کو
نظر اٹھاؤ خدا را، یہ کیا ہوا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا، یہ کیا ہوا تم کو
مری نظر سے اب آنے لگی حیا تم کو — یہ کیا ہوا تم کو

تمہاری آنکھ سے بیگانگی ٹپکتی ہے
نیاز و ناز سے اک بے دلی ٹپکتی ہے
رُخ اِس طرف ہے مگر بے رخی ٹپکتی ہے
وہ کیا کرے کہ جو پا کر نہ پا سکا تم کو — یہ کیا ہوا تم کو

آخر میں عاشق کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی محبوبہ کسی اور کی ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ بڑی خموشی سے محبوبہ سے یوں مخاطب ہو کر رخصت ہوتا ہے:

لبوں پہ مہر سہی ابروؤں سے کام تو لو
میں جا رہا ہوں، مرا آخری سلام تو لو
ان آنسوؤں میں جو غلطاں ہے وہ پیام تو لو
مسافروں سے کدورت نہیں روا تم کو — یہ کیا ہوا تم کو

عشق کا معاملہ یک طرفہ قطعی نہیں۔ یہاں دونوں طرف کم و بیش ایک سی تڑپ ہے جس کا اظہار جمیل کی کئی نظموں میں ہوا ہے۔ جمیل کی محبوبہ Urban نہیں ہے۔ وہ ایک معمولی سی گھریلو لڑکی ہے۔ وہ شادی کے بعد کسی اور کی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اندر عاشق کے لیے محبت بھری یادیں ہیں اور وہ اُسے بھول کر بھی یاد کرتی ہے، لیکن بہ ظاہر اس پر پردہ ڈالے رہتی ہے۔ جمیل نے اپنی نظم 'ڈرو خدا سے ڈرو' میں محبوبہ کے باطن میں اتر کر اس کے لطیف احساسات کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اس کے دل میں خموشی سے بیٹھ گئے ہیں:

جھکائے سر کو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ
کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ
اُٹھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ
نہ یوں نظر میں سماؤ – ڈرو خدا سے ڈرو – مجھے نہ یاد کرو

نظم ارتقا کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اب نماز میں بھی عاشق ہی نظر آنے لگا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھیں تو عذرا کی حالت کس قدر قابل رحم ہے کہ اُسے نمک اور شکر کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ یہ بند اردو شاعری کے سرمائے میں خوبصورت اضافہ ہے:

جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں، سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دیوانہ بناؤ – ڈرو خدا سے ڈرو – مجھے نہ یاد کرو

محبوبہ جانتی ہے کہ اگر آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو رسوائی کا خطرہ ہے۔ اپنی مجبوری اور بے بسی کا حال سناتی ہے اور عاشق کردار کو بہر طور دور ہی رہنے کی تلقین کرتی ہے:

جھنجھوڑ کر نہ جگاؤ کہ سو گیا ہے یہ دل
کئی برس سے عزاخانۂ وفا ہے یہ دل
خدا گواہ کسی کی محل سرا ہے یہ دل
پرائے گھر میں نہ آؤ – ڈرو خدا سے ڈرو – مجھے نہ یاد کرو

اس نظم میں 17 بند ہیں، یہاں نظم 'یہ کیا ہوا تم کو' اور مذکورہ بالا نظم پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل مظہری کا عاشق کردار ہو یا معشوق کردار، دونوں میں حد درجہ چاہتوں کے باوجود ہوش مندی اور سوجھ بوجھ بھی ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ جمیل محض تصنع بھری یا افلاطونی محبت کو خاطر میں نہیں لاتے اور نہ اس سے کوئی رشتہ رکھتے ہیں۔ اگر شدت ہے تو فطری ہے۔ جھجک ہے تو فطری ہے۔

مذکورہ بالا نظم ڈرو خدا سے ڈرو کے حوالے سے مظہر امام کا تجزیہ لائق توجہ ہے:

''ہر لفظ اس کی گھٹی گھٹی آرزوؤں اور دبی دبی آہوں کا آئینہ دار ہے۔ وہ سماجی بے انصافی کے باوجود اپنی ازدواجی ذمہ داری پورا کرنا چاہتی ہے۔ وہ مذہبی اور معاشرتی روایات کے احترام میں اپنے ذہن سے اپنے محبوب کا تصور بھی جھٹک دینا چاہتی ہے... وہ چاہ کر بھی اپنے محبوب کی یاد سے چھٹکارا حاصل نہیں کرپاتی...'' 5

جمیل کی اس نوع کی نظموں میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے کہ ان رومانیات وشبابیات کی شاعری میں بھی حقیقت کے عناصر زیادہ ہیں۔ ان کی محبوبہ اسی سماج کی گھریلو لڑکی یا عورت ہے جو ایک طرف عاشق کو بھولنا نہیں چاہتی تو دوسری طرف سماجی رسوم وقیود کو توڑ کر آزادانہ عاشق کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہیں بھاگ نہیں سکتی۔ وہ اپنی ذمہ داریوں اور سماجی بندھنوں کا احترام کرتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی 'ڈرو خدا سے ڈرو' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''جمیل مظہری نے ہندوستانی سماج کی اس مجبور و بے بس لڑکی کا نقش تیار کر کے اور اس کے زخموں کو عریاں کر کے اردو ادب کو ایک ایسا فن پارہ دیا ہے جسے آنے والی نسلیں ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ لیلیٰ کے خطوط کے بعد ہماری زبان میں عورت کی مظلومیت پر یہ دوسری کامیاب تخلیق ہے۔ جمیل مظہری نے چولھے کے پاس بیٹھ کر سالن جلانے والی لڑکی کے درد و کرب اور اس کے دل کی سلگتی ہوئی آگ کو جس موثر پیرائے میں نمایاں کیا ہے وہ جمیل مظہری کا ایسا اکتساب ہے جو ہمارے ادب کے اولیات میں شمار کیا جائے گا۔'' 6

عشقیہ نظموں میں 'سلام ماضی'، 'اُسے بھول جا بھلا دے' اور 'عشق ناتمام' (نقش جمیل میں اس زمرے کی آخری نظم) اہم ہیں۔ ان میں سے کسی بھی نظم کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے محض بھرتی کے عشقیہ مضمون کو منظوم نہیں کیا ہے بلکہ ایک ایک مصرعے میں ان کے ذاتی تجربے کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ 'سلام ماضی' میں محبوب کے بچھڑنے کے بعد کا منظر بہ شکل احساس یا احساس بہ شکل اشیاء نظر آتا ہے۔ روئے سخن محبوب ہی کی طرف ہے۔ اجڑے ہوئے مکان کی ویرانی اور شام وسحر کی بے کیفی محبوب کو سلام کہتی ہے۔ بادِ صبح کے جھونکے اور گھر کے پردے اور وہ چھت جہاں دو دل دھڑکتے تھے، محبوب کو سلام کہتی ہے۔ پوری نظم کی تشریح وتعبیر پیش نہیں کی جاسکتی۔

چمن کی فضائیں، ندی کے کنارے، سوگوار نگاہیں، چادر کی سوگوار شکن، آستین پر جو کاجل کے دھبّے تھے، قمیص کے اُدھڑے ہوئے گریبان اور محبوب کے ہاتھوں کے اس گریبان کے ٹانکے، تکیوں کے نقش ونگار، محبوب جس دوشالے کو اوڑھے ہوئی تھی اس میں بسی ہوئی خوشبو، سنگار کا آئینہ — گویا یہ تمام مجرد اشیا محبوب کو سلام کہتی ہیں۔ یہ نظم نہیں بلکہ جذبہ واحساس کا مرقع ہے۔ اس نظم میں گیارہ بند ہیں۔ دو بند ملاحظہ کیجیے:

اک اجڑی سیج پہ چادر کی سوگوار شکن اور اس شکن کی حکایت سلام کہتی ہے
اک آستیں پہ وہ کاجل کے جا بہ جا دھبّے وہ آنسوؤں کی امانت سلام کہتی ہے

کسی قمیص کے اُدھڑے ہوئے گریباں پر تمہارے ہاتھ کے ٹانکے سلام کہتے ہیں
ابھر گئے تھے جو تکیوں پہ بن کے نقش ونگار تمہارے دل کے وہ جذبے سلام کہتے ہیں

نظم 'اُسے بھول جا بھلا دے' میں بھی ماضی کی شکستہ یادیں ہیں جو منظوم ومصور ہوگئی ہیں۔ جمیل کی عشقیہ نظموں میں اگر کہیں کہیں رنگ اور رس کی کمی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں حسن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا جس کا اعتراف انھوں نے اپنے مضمون 'میرا نظریہ شعر اور میری شاعری' اور 'شعر وشاعر' میں کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی عشقیہ نظموں میں ان کا تخلیقی وفور دیکھا جاسکتا ہے۔

مجموعۂ کلام 'نقش جمیل' میں جو رنگ نظر آتا ہے وہ 'عکس جمیل' میں آکر کچھ پھیکا ہوجاتا ہے۔ فاصلے، یادِ ماضی، مہجوری، فراق سی سالہ جیسی نظمیں ملاحظہ کیجیے تو ایک سرد ہوتی ہوئی آنچ کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ

شاعر کے باطن میں اپنی معشوق سے دوری ومجبوری کے جذبات بھرے ہوئے ہیں۔جمیل کی داستان عشق میں ماضی کی ٹھٹھری ہوئی شب فراق اور سہمی ہوئی واردات قلب کی موجیں ہیں۔ نظم 'فاصلے' میں ایک معمر حسینہ کو دیکھ کر ایک بوڑھے شاعر کے جذبات پیش کیے گئے ہیں جبکہ 'یادِ ماضی' کے بریکیٹ میں بوڑھے عشق کی بوڑھی کہانی درج ہے پھر یہ بھی لکھا ہوا ہے— مدتوں کے بعد عذرا کو دیکھ کر۔ کچھ مثالیں دیکھیے:

اور چہروں کی جھریوں میں آج ایک بگڑا ہوا فسانہ ہے
کون کہتا ہے یہ کہ جذبۂ عشق فاتحِ گردشِ زمانہ ہے
تھا وہ اک فتنۂ شباب عذرا
تشنگی ہے نہ اب سراب عذرا

———

یہ جو چہرے پہ شام ہے عذرا وقت کا انتقام ہے عذرا
یہ دھندلکے یہ ملگجے سائے رات کا اک پیام ہے عذرا
(ماخوذ: یادِ ماضی: عکس جمیل)

———

محبت نے تو دستک دی کئی بار خرد نے دل کے دروازے نہ کھولے
امیدیں ہیں، نہ ارماں ہے، نہ حسرت کوئی گھر میں نہیں تو کون بولے
یہ آہ سرد اک گونگی فغاں ہے
یہ ٹھنڈی آگ کا ٹھنڈا دھواں ہے

———

میری عذرا میری شمع فکر وفن کی روشنی میری عذرا میرے ماضی کے کھنڈر کی چاندنی
جب تصوّر پھاندتا ہے بیچ کی دیوار کو دیکھتا ہوں تیرے کمھلائے ہوئے رخسار کو
اشک آنکھوں میں اگر آتے ہیں، پی لیتا ہوں میں زخم کا ٹانکا اگر ٹوٹا تو سی لیتا ہوں میں
بھول جا اس اتصالِ عارضی کو بھول جا بھول جا عذرا اب اپنے مظہری کو بھول جا
(ماخوذ: فراق سی سالہ: عکس جمیل (ایک منظوم افسانہ))

ان نظموں میں جو یاس اور اضمحلال کی کیفیت ہے وہ اواخر عمر کے ہیں، لیکن غور کیجیے کہ ماضی اور اس کی یادیں کس طرح پرچھائیں بن کر ایک انسان کا تعاقب کرتی ہیں۔جمیل مظہری کی اس پرچھائیں سے کوئی تصویر جھانکتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ بہت سے جمیل شناسوں نے اس پرچھائیں کی شناخت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ جمیل مظہری نے اس پرچھائیں سے اپنے کسی بھی نوع کے رشتے سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ جمیل مظہری نے سیاسی وسماجی مسائل کو بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ وہ 1942 میں جیل بھی جا چکے تھے۔ ان کا ذہن صرف ایک شاعر اور فلسفی کا ذہن نہیں تھا بلکہ وہ ایک بیدار مغز ہندوستانی شہری بھی تھے۔ عام طور سے سیاسی نظمیں وقتی تصور کی جاتی ہیں لیکن جمیل کی ایسی بیشتر نظمیں ان کی فکری جہت سے ہم آہنگ ہوگئی ہیں۔ انھوں نے سیاسی شعور سے اپنے فکر وفلسفہ کو الگ نہیں رکھا ہے۔ انھوں نے 1933 میں کاروان انقلاب کے لیے 'نوائے جرس' کے نام سے ایک نظم کہی تھی جو رواں اور پُراثر ہے۔ اس میں 17 بند ہیں۔ بطور نمونہ یہ حصے دیکھیے:

اٹھائے سر بڑھے چلو تنے ہوئے غرور سے تمہارے قافلے کی شان دیکھتی ہیں دُور سے
ہمالیہ کی چوٹیاں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو، بڑھے چلو
قسم تمھارے عزم کی، فدا تمھاری شان کے بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے
جھکا دو شاخِ کہکشاں، بڑھے چلو بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں، بڑھے چلو بڑھے چلو

اسی طرح تغیرات، جوانوں سے، مزدور کی بانسری، بھارت ماتا، زمزمہ، بعد المشرقین، اے مردِ جواں چل، یوم آزادی، وقت کو پھیرنے والے جیسی نظمیں (نقشِ جمیل سے) پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گہرا سیاسی اور سماجی شعور رکھتے تھے۔ 'عکس جمیل' میں کچھ نظمیں ایسی ہیں جو غیر ضروری سی بھی لگتی ہیں جیسے رباعیات اندرا، (تین رباعیاں)، تحریک نس بندی کے سلسلے میں (رباعیات چار عدد، پھر چھوٹی سی نظم)، کنگال نہ بن (یہ بھی بالواسطہ نس بندی کی تحریک کو فروغ دیتی ہے)، بھوک لگی ہے بھوک وغیرہ۔ سیاسی وسماجی نظموں کے علاوہ متفرقات اور باقیات کے عنوان سے بھی بہت سی نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ عکس جمیل

میں 21 عدد تہنیتی نظمیں شامل ہیں۔عکس جمیل میں باب متفرقات میں دو نظمیں ایسی ہیں جنہیں فکری نظموں کے ذیل میں شامل کیا جاتا تو بہتر تھا۔ یہ نظمیں ہیں 'اپنا تعارف' اور 'فرزندان اہرمن سے'۔عکس جمیل ہی میں نذر عقیدت کے باب میں 16 نظمیں شامل ہیں جن میں گرونانک اور خیام سے لے کر غالب، اقبال، ٹیگور، حسرت، پریم چند، نیاز فتح پوری اور کلیم الدین احمد کے تئیں عقیدت کے پھول پیش کیے گئے ہیں۔

جہاں تک سیاسی نظموں کا تعلق ہے اور جو کچھ مثالیں پیش کی گئیں، ان کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ چند ایک نظموں کو چھوڑ کر جمیل کی بیشتر سیاسی و سماجی نظمیں اپنے طرز اظہار اور آہنگ و اسلوب کے لحاظ سے اثر انگیز اور دیرپا ہیں۔ 'عکس جمیل' ہی کی ہندو پاک کے کویوں اور شاعروں کے نام، کچھ کڑوی کچھ میٹھی، اردو زبان، مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم، مسلمان کرسی نشینوں سے، صحافیوں سے، جیسی نظمیں پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ فکر و فلسفہ کی شاعری سے الگ انھوں نے انسانی زندگی اور سیاسی وسماجی مسائل اور معاشرے کی اتھل پتھل پر بھی گہری نظر رکھی ہے۔نظم 'اردو زبان' 11 حصوں پر مشتمل ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اردو کس طرح ہندوستان میں پلی بڑھی اور اس کی تہذیب و تدوین میں صوفیوں، خانقاہوں، کبیر و نظیر اور مندر و مسجد کا کیا رول اور حصہ رہا ہے۔ بہت ہی رواں اور پراثر نظم ہے۔ منتخب حصے دیکھیے:

اے دولتِ ہندوستاں، اے زینتِ بزم جہاں
تیری بہارِ بے خزاں ہر خار و گل کی ترجماں
محفل میں ہو یا جنگ میں — ہر راگ میں ہر رنگ میں
جذبوں کے ہر اظہار میں — فتنوں کی ہر رفتار میں
تعمیر میں تحریک میں — تعریف میں تضحیک میں

اے صوفیوں کی لاڈلی — اے خانقاہوں کی پلی
تیری انگوٹھی دل نشیں — غالب کا دل جس کا نگیں

سوزِ نظیرِ بے نوا — روحِ کبیرِ باصفا
مسجد میں تو مندر میں تو — ہر دل میں تو ہر گھر میں

اردو ترے شمس و قمر — تابندہ تر پائندہ تر
زیبندہ تر، رخشندہ تر — افراختہ، افروختہ
تہذیب کا اندوختہ — ہو ریختی یا ریختہ
ہے بیختہ آمیختہ — اک جام میں شیر و شکر
تو ہے حصارِ بیکراں، تو بے زمان و بے مکاں
ظرف اس کا خود ہی تنگ ہے جو سر کہ ہے تجھ سے گراں

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کی سیاسی نظموں کے حوالے سے جو آراء پیش کی ہیں ان میں جمیل کے تئیں ان کا پُرخلوص جذبہ اور حد درجہ عقیدت کا عکس نظر آتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

''ان کی انقلابی و سیاسی نظموں میں ایک ترقی پسند نقطۂ نظر اور تعمیری زاویۂ نگاہ ملتا ہے۔ان کی آواز میں جوش کا کھردراپن، کرختگی اور پھٹے ہوئے بانس کا سا انداز نہیں ہے... اُن کے نغموں میں مادر وطن کا احترام بھی ہے اور غلامی کا کرب بھی، اس لیے اُن کی آواز میں رس اور ان کے نغموں میں ایسا گداز ہے جو پڑھنے والوں پر ایک خوشگوار اور دیرپا اثر چھوڑ رہا ہے۔''[7]

جمیل مظہری کی ترقی پسند تحریک سے باضابطہ وابستگی نہیں تھی لیکن غریبوں، مفلسوں، کسانوں اور مزدوروں کے دکھ درد سے وہ پوری طرح آشنا تھے۔انھوں نے مزدوروں اور غریبوں کے حوالے سے کئی نظمیں کہی ہیں۔غریبوں کی عید، بھوک، مزدور کی بانسری سے، مزدور کی آواز کے علاوہ ''عکس جمیل'' کی بھوک لگی ہے بھوک، مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم، عید امروز، جیسی نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک پرخلوص انسانی جذبے کے تحت معاشرے کی طبقاتی کشمکش کو سمجھ رہے تھے۔ہندوستان میں ترقی پسند تحریک (1936) سے پہلے ہی انھوں نے ایسی بہت سی نظمیں کہیں جس نوعیت کی نظمیں بعد میں ترقی پسندوں نے کہیں۔انھوں نے 22 برس کی عمر میں مزدور کی آواز (1927) کہی تھی، غریبوں کی عید، 39 برس کی عمر میں کہی گئی۔

تہنیتی اور تعزیتی نظموں کے علاوہ جمیل مظہری نے قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔تعزیتی نظموں

اور قطعات کی تعداد 57 (عکس جمیل) ہیں۔ ان میں آہ جواہر لال، بتعزیت (بروفات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد) آہ ذاکر آہ، ماتم جگر، آہ احتشام!، قطعہ تاریخ خلیل الرحمٰن اعظمی، ماتم سہیل عظیم آبادی وغیرہ اہم ہیں۔ نقش جمیل میں بھی متفرقات کے باب میں اس نوعیت کی تین نظمیں ہیں: ایک دوست کی بچی کی قبر پر، گاندھی جی، نجم کی یاد میں۔ گاندھی جی پر جو نظم کہی گئی ہے وہ مسدس کے فورم میں ہے اور 19 بندوں پر مشتمل ہے۔ یہاں صرف ایک بند ملاحظہ کیجیے:

نثار ہوتے ہیں شعلے یہ کس کی میت پر   یہ کون ہوگیا قربان روحِ ملت پر
یہ کس کے خون کے دھبّے ہیں آدمیت پر   مقامِ حیف ہے اے ہند تیری قسمت پر
بہار آتے ہی لوٹا خزاں نے باغ ترا
تری ہواؤں نے گل کردیا چراغ ترا

علامہ اقبال سے جمیل مظہری بہت متاثر تھے۔ انھوں نے اقبال کو اپنا مرشدِ فن بھی کہا ہے۔ جگہ جگہ جمیل مظہری کی نظموں پر اقبال کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے یہاں ان کی دو مشہور نظموں فریاد، جواب فریاد/ اثر فریاد کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ 'آب وسراب' سے پہلے کی تخلیق ہے۔ 'آب وسراب' بعد میں 1970 میں منظرعام پر آئی جب کہ فریاد 1955 میں کہی گئی اور اس کے کچھ حصے پٹنہ کے پندرہ روزہ 'صنم' میں 1959 ہی میں شائع ہوگئے تھے۔ اسی زمانے میں پہلی بار پوری نظم فریاد سوغات، دہلی نے شائع کی۔ ساتھ ہی انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے اسے اپنے انتخاب میں شامل کیا۔ بعد میں کائنات ہدایت گڑھ، جمیل مظہری نمبر نے 1982 میں فریاد اور جواب فریاد (اثر فریاد کے نام سے) دونوں کو ایک ساتھ شائع کیا۔ جواب فریاد ۱۹۷۷ء میں کہی گئی۔ یہ نظم اقبال کی پیروی میں کہی گئی ہے۔ لیکن اسی بحر میں ہونے کے باوجود فکری رچاؤ اور موضوع کے لحاظ سے دونوں نظموں میں فرق بھی ہے۔ لفظیات اور طرزِ ادا اور بحر یکساں ہونے کے باوجود جمیل نے پھر بھی اپنی الگ شناخت بنائی ہے۔ اقبال کے آہنگ سے اور اس کی گرفت سے آزاد ہونا بہت آسان نہیں تھا۔ حالاں کہ اقبال کے تئیں جمیل نے 'فریاد' کے نیچے یہ لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے:

''اپنے مرشدفن اقبال کو ایک سجدۂ عقیدت کے ساتھ — جمیل مظہری''

'فریاد' میں جمیل اپنی فلسفہ طرازیوں اور کائنات کی موشگافیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ وہ سراپا سوال نظر آتے ہیں۔ وہ عقل وعشق کی بات بھی کرتے ہیں اور یہ شکایت بھی کہ نور کے چہرے پر ظلمت کا پردہ کیوں ہے۔ یہاں بادِصبا بھی مجروح کیوں ہے، ہر آدمی تیرے اس عزاخانے میں مغموم نظر آتا ہے۔ انسان جو تیری تخلیق کا شہکار ہے وہ اس درجہ متحیر، متفکر اور لاچار کیوں نظر آتا ہے۔ پھر انسان پر طنز کرتے ہیں کہ یہ انسان تو اپنی خواہشات اور اپنے مذاہب کا غلام ہے۔ کبھی تو یہ فطرت سے مبارز ہے تو کبھی اس کا غلام ہے اور اس کے باوجود اس میں آزادی کا حوصلہ چہ معنی دارد؟ اس نظم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جمیل نے کسی خاص مذہب یا فرقے یا مسلک کی بات نہیں کی ہے بلکہ پورے عالم یا تمام انسانی قدروں اور انسانی مسائل کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں ہمارے معاشرے کی دکھتی رگ پر صرف ہاتھ رکھنے کی کوشش ہی نہیں ملتی بلکہ جمیل اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ شکوہ کے تتبع کے باوجود یہ نظم ہمارے عہد کے مسائل کو سامنے لاتی ہے۔ یہ چند بند ملاحظہ کیجیے:

کس سے پوچھوں کہ یہ ہنگامۂ ہستی کیا ہے   یہ فسوں کیا ہے، جنوں کیا ہے، یہ مستی کیا ہے
برق یہ ابر کی ہر چیخ پہ ہنستی کیا ہے   جب بلندی کی یہ فطرت ہے تو پستی کیا ہے
چہرہ نور پہ یہ پردۂ ظلمت کیوں ہے
یہ اندھیرے کو اجالے کی ضرورت کیوں ہے
قطرہ دریا میں نہ گم ہو تو ہو مٹّی کی غذا   تنکے گلخن میں نہ جھلسیں تو ہوں آندھی کی غذا
تھا یہ انصاف کہ طاقت ہو ضعیفی کی غذا   تیری دُنیا میں مگر گھاس ہے بکری کی غذا
اور بکری کا لہو، شیر کی طاقت توبہ
کتنا بے رحم ہے قانونِ طبیعت توبہ

اس نظم کی ہم عصریت کو ان دو بندوں کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے:

یوں تو انصاف کی ہوتی رہی شورا شوری   نہ گئی ظلم کے ہاتھوں سے خرد کی ڈوری
اس کے سو بھیس ہیں کہتے ہیں جسے سب چوری   خوں سے کمزور کے پلتی ہے یہاں شہ زوری
موت جب جرم ضعیفی کی سزا ہو یارب
کیوں نہ شاعر تری سنت سے خفا ہو یارب

جن سے پہنچے ترے ناموسِ عدالت کو گزند   ان کا پرچم بھی بلند ان کا ستارہ بھی بلند
اور جو حق کے منادی ہیں وہ زنداں میں ہوں بند   بات سیدھی ہے کہ گاہے بہ سلاے مے رنجند
حق و باطل میں بہرحال جدائی نہ ہوئی
یہ تو شاہی ہوئی سرکار خدائی نہ ہوئی

اوپر 'فریاد' کے 60 بند سے صرف چار بند ہی پیش کیے گئے ہیں۔ جمیل کا جو مطمحِ نظر اس نظم میں ہے؛ اُسے پوری طرح نہ سہی، اس کا کچھ تو عکس آ ہی گیا ہوگا۔ 'فریاد' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل تشکیک سے گزر کر خدا کی خلاقی اور ربوبیت والوہیت کو بھی سینے سے لگا لیتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

لکنتِ شاعرِ ژولیدہ بیاں بھی تیری   نطق بھی تیرا عطیہ، یہ زباں بھی تیری

اسے آخر کیا کہیں گے؟ جمیل کو خود اس بات کا احساس ہے کہ اس کی فکر ابھی کچی ہے اور اس کا ایمان تشکیک سے گزر رہا ہے۔ ایک بند میں یہ کہتے ہیں جو کہ ان کا اقرار بھی ہے:

کُشتۂ نازِ خرد ہے دلِ ناداں میرا   ابھی تشکیک کی منزل میں ہے ایماں میرا

واضح ہو کہ 'فریاد' کے 22 برسوں بعد جمیل نے 'جوابِ فریاد' لکھی۔ اس میں جمیل نے یہ اجتہاد کیا ہے کہ مسدس کی ہیئت میں رکھتے ہوئے اس کے تیسرے مصرعے کو قافیے سے آزاد رکھا ہے، انھوں نے خود اس پر نوٹ بھی لگایا ہے۔ جواب میں بھی حسبِ معمول جمیل نے فلسفیانہ اور گہرے فکری رموز کو پیش کیا ہے جو خدا کی طرف سے ہے۔ یہاں بھی برجستہ انداز بیان ملتا ہے۔ 'فریاد' جہاں 60 بندوں پر مشتمل تھی، 'جوابِ فریاد' یا اثرِ فریاد محض 48 بند پر سمٹ گئی ہے۔ اقبال کے یہاں معاملہ بالکل الٹا تھا۔ شکوہ میں 31 بند اور جوابِ شکوہ میں 36 بند ہیں۔ یعنی خدا کی طرف سے جو جواب ہے وہ پانچ بند زائد پر مشتمل ہے۔ جمیل کے یہاں فریاد زیادہ ہے اور جواب میں 12 بند کم ہو گئے ہیں۔ یہ معاملہ بھی کچھ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

جمیل نے 'جوابِ فریاد' میں انسان کے پیچیدہ افکار اور فسادِ ذہنی کو موضوع بنایا ہے اور خدا کی طرف سے انسان کی ذمہ داری کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا میں طاقت و ضعف میں جو جنگ ہے یا مختلف النوع خداؤں کے تراشے اور پوجے جانے کا جو عمل جاری ہے، ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ خدا نے کس طرح انسان کی تخلیق کی ہے، یہاں سے لے کر انسانی جبلتوں، آپسی چپقلشوں اور مجبوروں اور بیواؤں کی آہوں سے لے کر مشیتِ الٰہی کے رموز، پیغمبروں کے ظہور میں آنے اور نئے

امکانات تک کی باتیں کی گئی ہیں۔ یہ بند پیش کیے جاتے ہیں:

تم نہ طاعت کے لیے ہو نہ محبت کے لیے   مسئلہ بن گئے ہو ذہنِ مشیت کے لیے
تم سے انصاف کا طالب ہے تمہارا خالق   تم بنائے گئے جس بارِ امانت کے لیے
تم نے وہ بار اُٹھایا کہ نہیں، تم سوچو
ناز سہنا تمھیں آیا کہ نہیں، تم سوچو

کیا نتیجہ ہوا تم موردِ الزام رہے   ختم پرواز ہوئی مرغِ تہِ دام رہے
نسلِ آدم میں رہا ضعفِ عزائم کا قصور   پختگی آ نہ سکی خام تھے تم، خام رہے
اسی عجلت کا نتیجہ ہے تمھاری خامی
جس کو نافہم سمجھتے ہیں ہماری خامی

اس کا اختتام جس بند پر ہوتا ہے اس کے آخری دو مصرعے یوں ہیں:

گرچہ گستاخ بہ اندازِ تکلم ہے جمیل
دیکھو میرے لبِ رحمت پہ تبسم ہے جمیل

'فریاد' اور 'جوابِ فریاد' / اثرِ فریاد یہ دونوں نظمیں جمیل کے تخلیقی سرمائے میں اضافہ تصور کی جائیں تو حیرت نہیں بلکہ اس پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوگا۔

فکر و فلسفہ کے مضامین، عشقیہ رموز اور سیاسی و سماجی سروکار پر سنجیدہ اسلوب میں جمیل مظہری نے شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں، لیکن انھوں نے طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کو بھی مختلف مضامین کے لیے اختیار کیا ہے۔ اگر بغائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ طنزیہ و ہجویہ شاعری میں جمیل نے اچھے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ جمیل کی ہجویہ شاعری کی یہ خوبی ہے کہ ابتذال کے عناصر نہیں ملتے۔ رضا نقوی واہی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''جمیل مظہری کی ہجویات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ثقہ لوگوں کے سامنے بھی پڑھی جاسکتی ہیں اور خود اس کے ہونٹوں پر بھی تبسم لا سکتی ہے جس کی درگت بنائی گئی ہو۔''[8]

نقش جمیل میں طنزیات وہجویات کا باب نہیں ہے۔ البتہ 'عکس جمیل' میں طنزیات وہجویات کے باب میں 16 نظمیں شامل ہیں۔ ان میں کچھ کے عنوانات قائم کرکے رباعی، قطعہ، غزل اور قصیدہ کی ہیئتوں میں ہجویہ شاعری کی گئی ہے۔ ایسی بیشتر نظمیں 33ء اور 34ء کے آس پاس کی ہیں لیکن جمیل نے ان کو نقش جمیل میں شامل نہیں کیا تھا۔ بعد میں رضا مظہری نے نوٹ لکھ کر (واضح رہے کہ یہ نوٹ عرض مرتب کے عنوان سے 2/اگست 1986 کو لکھا گیا تھا جب کہ کتاب 1999 میں شائع ہوئی) 'عکس جمیل' میں شائع کرایا۔

عکس جمیل میں طنزیات وہجویات کے عنوان سے آخر میں 16 عنوانات کے تحت چھوٹی بڑی نظمیں ہیں جو مختلف ہیئتوں میں کہی گئی ہیں۔ ان میں طنز کی کاٹ شدید ہے۔ کہیں کہیں البتہ سوقیانہ انداز بھی عود کر آ گیا ہے جسے پڑھ کر لگتا ہے جیسے یہ کلام جمیل مظہری جیسے ثقہ شاعر کا نہیں۔ کہیں ذاتی عناد کا احساس بھی ہوتا ہے۔ پہلے ان کی ایک نظم 'فقیر کی صدا' کا ذکر کیا جائے۔

'فقیر کی صدا' دس بندوں پر مشتمل ایک نظم ہے جس میں حسن کی درگاہ پر ایک عاشق حاضری دیتا ہے اور کس کس انداز اور حوالے سے دیتا ہے، اس کا تفصیلی بیان ہوا ہے۔ ایک بند دیکھیے:

عزتِ اجداد و آبا بیچ کر　　　آبروئے دین و دنیا بیچ کر
اپنی بی بی کا دوپٹہ بیچ کر　　　پڑی و بالی وکنگنا بیچ کر
آئے ہیں پیاری تری درگاہ پر
ایک بوسہ دے خدا کی راہ پر

مشہور فلمی اداکارہ کجّن بائی اور اُن کے مداح صحافیوں وغیرہ کے حوالے سے جو طنزیہ شاعری کے نمونے ہیں وہ دل چسپ اور عبرت آمیز ہیں۔ مسدس کے فورم میں جو ہجو ہے اس کا عنوان ہے ''مسدس خلع النعلین''۔ اس میں کجّن اور اس کے عاشقوں پر جس طرح چوٹیں کی گئی ہیں وہ بے لاگ ہیں۔ دو بند پیش کیے جاتے ہیں:

آمادۂ نبرد کھڑا ہے رسالہ دار　　　پیچھے ایاز فوج کے ہجڑے ہیں بے شمار
کہتے ہیں رکھ کے ناک پہ انگلی کہ دور پار　　　ہاتھوں میں سرخ سبز علم ہائے زرنگار
فسق و فجور و کفر کے پرچم اڑاتے ہیں

کجن کی ساڑیوں کا پھریرا بناتے ہیں
آ چل کے کھولیں باب خرابات ساقیا　　　دکھلائیں تجھ کو جوتوں کی برسات ساقیا
دے مئے کہ کہہ دیں نشّے میں کل بات ساقیا　　　کجّن سبھا میں ناچ تھا کل رات ساقیا
لیکن نہ رنڈیوں کا نہ بندر کا ناچ تھا
راوی کا ہے بیان اڈیٹر کا ناچ تھا

اسی تسلسل میں کجّن کے حوالے سے 'قصیدہ عشقیہ' ہے لیکن اس میں ہجو یا طنز کے عناصر کم ہیں۔ بلکہ اس میں شاعر نے کجّن کے شباب اور حسن کی تعریفیں کی ہیں۔ البتہ اس کے عنوان کے نیچے جو فقرہ درج ہے وہ طنزیہ اور ہجویہ ہے، جو اس طرح ہے: ''در مدح ملکہ جہاں آرائے فلمستان'' رہزن عقل و غارت گر ایمان مس کجّن محبوبۂ جن وانس وحیوان، رحم اللہ طینتہا وزاد اللہ قامتہا۔'' اس کا ایک شعر بھی ہے جس سے ہجو اور طنز کا رنگ ابھرتا ہے:

سخن طراز سخنور نواز شاعر گر　　　ولی فریب و اڈیٹر شکار وسیٹھ افگن

کجن کے حوالے سے قصیدہ اول کے بعد قصیدہ ثانی اور پھر مطلع ثانی بھی آیا ہے۔ بعد کے دونوں کے قوافی پہلے والے سے مختلف ہیں۔ لہٰذا چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

رہی کجن کو ہاتھوں ہاتھ گردش مثل پیمانہ　　　نشیلی آنکھ کا رس پی گئے یارانِ میخانہ
یہ شمعِ محفل آرا کیوں نہ پہنچے خانقاہوں تک　　　کہ اس پر صوفیان صابری مسلک ہیں پروانہ
نہ ہوگی ایشیا کی کوئی رنڈی اتنی بے غیرت　　　کبھی ہے باپ کا بازو کبھی بیٹے کا ہے شانہ
(قصیدہ ثانی)
پئیں جھک کر مے تند ہوس یارانِ فرزانہ　　　بڑھاپے تک رہے آباد کجن تیرا میخانہ
ہوا جس روز خالی مے سے ساغر چشم میگوں کا　　　کھسک جائیں گے متوالے اجڑ جائے گا میخانہ

ایک اور قصیدہ عشقیہ امام باندی بیگم المعروف بہ مس رتن بائی ہے جس میں ہجو کے عناصر خوب خوب موجود ہیں۔ 'مثنوی فلفل سرخ' اور 'مثنوی تنبیہ الاحباب' بھی ہجویہ شاعری کی اچھی مثالیں ہیں لیکن جمیل مظہری کی اس نوع کی شاعری کا سارا دار ومدار ان کی دو ہجویہ نظموں 'شہر آشوب' صحافت اور 'اے مولوی مکھن' پر ہے۔

اپنی نثری تحریروں میں بھی جمیل نے بدقماش صحافیوں کے بخیے ادھیڑے ہیں۔ نظم 'شہر آشوب صحافت' میں طوائفوں اور صحافیوں کے رشتے کو ہدف بنا کر مختلف زاویے سے جمیل نے نشتر چبھوئے ہیں۔ مسدس کی ہیئت میں 35 بند پر مشتمل یہ نظم پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل نے اپنے دل کے پھپھولے کس طرح پھوڑے ہیں۔ شدت احساس اور شدت جذبات سے نظم کہیں کہیں مغلوب بھی ہوئی ہے لیکن باوجود اس کے اس میں اُن کی طبع رواں کام کرتی نظر آتی ہے۔ صرف تین بند پیش کیے جاتے ہیں:

یہ بوسوں کے سائل یہ جلوؤں کے بھوکے — پھرا کرتے ہیں شام سے کوٹھے کوٹھے
طوائف کی جانب ہیں اس طرح تکتے — تکیں خوانِ نعمت کو جس طرح کتّے
مگر ایک لقمہ بھی ملتا نہیں ہے
رئیسوں کا جوٹھا بھی ملتا نہیں ہے

کسی بیسوا کو قلم پر نچانا — کسی مال زادی کو بیگم بنانا
لقب دے کے ملکہ کا اونچا اڑانا — اڑانا اڑا کر زمیں پر گرانا
جو دے نقدۂ، گن یہ گاتے ہیں اس کا
نہ کس طرح گائیں کہ کھاتے ہیں اس کا

ہو ایسے شریفوں پہ شیطاں کی لعنت — جو رنڈی پہ کرتے ہیں مشقِ صحافت
گناہوں کو کہتے ہیں فنّی حقیقت — نہیں دور از بسکہ روزِ قیامت
گنہگار سب چھوٹ جائیں گے یکسر
جہنم کو بھر دیں گے فلمی ایڈیٹر

اب ذرا ایک مشہور ہجو کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کی بڑی شہرت رہی ہے جس کا نام ہے 'ہجو مولوی مکھن'

اس زمانے میں فلمی رسالوں میں ہیروئنوں اور طوائفوں کی بے جا تعریفیں چھپتی تھیں۔ یہاں تک کہ خواجہ حسن نظامی جیسے سجادہ نشیں نے بھی ہیروئنوں کے قلمی چہرے لکھے جس کے حوالے سے اس میں ایک بند بھی ہے اور دوسری جگہوں پر اشارے ہیں:

ہجو 'مولوی مکھن' کی جو شانِ نزول ہے وہ نظم کے اوپر بطور نوٹ کے درج ہے:

''پٹنہ کے دریاپور محلّہ (اب اسے سبزی باغ کہتے ہیں) میں ایک

مولوی صاحب تھے جنہوں نے گھی اور مکھن کی دکان کھول رکھی تھی۔ اس رعایت سے لوگ انھیں مولوی مکھن کہنے لگے تھے۔ نام ان کا کچھ اور تھا۔ اتفاقاً شاعر کے ایک دوست نے اس دکان سے گھی لا کر دیا اور تعریف کی کہ بہت ہی خالص ہے۔ مگر شاعر نے اس گھی کو استعمال کیا تو ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ برجستہ انھوں نے یہ ہجو لکھی جو احباب کی زبان زد ہوگئی۔ خود مولوی مکھن اسے بڑے فخر سے لوگوں کو سناتے۔'' 9

بہرحال اس کے بھی کچھ بند پیش کیے جاتے ہیں:

تم عقل کے دشمن ہو کہ ایمان کے دشمن
یا اپنی ہی اٹھتی ہوئی دکّان کے دشمن
کیوں اپنے خریدار کی ہو جان کے دشمن — اے مولوی مکھن
چربی کا بھی کچھ میل، کراسن کا بھی کچھ میل
یہ گھی ہے کہ پنجاب کے سانڈے کا سڑا تیل
جاڑے میں طلا کے لیے موزوں ہے یہ روغن — اے مولوی مکّھن
جائے گا جہنّم میں جو تو حکمِ خدا سے
آگ اور بڑھے گی تری داڑھی کی ہوا سے
اور ہوگا اسی گھی میں بھگویا ہوا ایندھن — اے مولوی مکّھن
اے مولوی اس ریش معلیٰ پہ ہو لعنت
عمّامہ و تسبیح و مصلا پہ ہو لعنت
قرآن بھی پڑھ کے نہ ہوا متدین — اے مولوی مکھن

مذکورہ بالا مثالوں کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جمیل کی شاعری میں طنزیہ و ہجویہ نوع کی شاعری کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے اندر جو برجستگی اور فطری پن تھا اس کا اندازہ ان نظموں سے ہوتا ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چوں کہ ان کے یہاں گہرے فکر و فلسفہ کا رجحان غالب تھا اس لیے

نظموں اور غزلوں میں اسی غالب رجحان پر سوچتے رہے اور اسی تناظر میں نظمیں، غزلیں، مثنویاں اور قصائد کہتے رہے۔

غزل گوئی

اپنی غزلوں کے بارے میں جمیل مظہری نے خود ہی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے جو لکھا ہے آپ بھی سنیے:

''میری غزلوں کا سرمایہ میرے چند الجھے ہوئے افکار ہیں جنھیں آپ نواب امداد صاحب اثر کی زبان میں امور ذہنیہ کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ان امور ذہنیہ کو تغزل کا پیرایہ عطا کروں لیکن یہ سلیقہ مجھ میں کبھی نہیں آیا۔ میرا ایک مطلع جو تنہا میری شہرت کا ذمہ دار ہے:

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

تغزل کی لطافت اس شعر کے دوسرے مصرعے کا تحمل تو کرلے گی، لیکن 'بقدر پیمانہ تخیل' نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کا اسلوب۔'' [10]

جمیل نے 'بقدر پیمانۂ تخیل' کو غزل کی زبان اور غزل کا اسلوب تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ حالاں کہ ان کی غزل کا اختصاص یہی ہے۔ دوسرے مصرعے کا تقاضا بقدر پیمانۂ تخیل کا ہی تھا۔ یہاں اگر دوسرا ہلکا پھلکا لفظ یا مرکبات میں سے کچھ رکھا جاتا تو پھر یہ کسی مشاعرے باز شاعر کا شعر ہو کر رہ جاتا، جمیل کی انفرادیت اسی 'پیمانۂ تخیل' میں ہے۔ جہاں تک تغزل میں لطافت کی بات ہے تو یہ ایک مبہم سا لفظ ہے۔ لطافت لفظوں کے بجائے پورے آہنگ سے پیدا ہوتی ہے۔ جمیل صاحب میر، آرزو، صفی لکھنوی وغیرہ کی لفظیات دیکھ دیکھ کر کیوں کڑھتے رہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اقبال کے فلسفیانہ افکار کو میر و مصحفی کے ڈکشن میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے فکری عناصر کو پیش کرنے کے لیے جس اسلوب کی ضرورت تھی، اسے بلاشبہ جمیل نے اپنایا۔ پھر یہ کہ جمیل نے نظموں، رباعیوں، مرثیوں کے لیے بھی اسی اسلوب سے کام لیا ہے۔ ہر شاعر کا ایک ڈکشن ہوتا ہے جس سے اس کی شناخت ہوتی ہے۔ جمیل کو بلاوجہ اپنی غزلوں کے حوالے سے مایوسی تھی۔ ان کے یہاں جو شعور و آگہی کے قصے اور مابعد الطبعیاتی شعور کی نیرنگیاں ملتی ہیں،

وہ اپنا ڈکشن خود وضع کرلیتی ہیں۔ پھر یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ جمیل پر غالب اور اقبال کا بہت اثر رہا ہے، فکر اور اسلوب دونوں لحاظ سے۔ بلکہ اگر بغور دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اقبال کے لفظ خودی اور بے خودی کو بھی بہت استعمال کیا ہے لیکن چوں کہ جمیل کا ذہن انتشار اور تشکیک کا شکار تھا اس لیے یہ دونوں الفاظ محض لفظوں اور معنوی اعتبار سے استعمال ہوتے رہے، کسی فکری نظام کا روپ نہ لے سکے۔ اقبال کے اسلوب میں یہ اشعار دیکھیے:

یہ قبائے کہنہ اتار دو نہ سبک ہو چشم نیاز میں — کہ جگہ جگہ سے ہے کہنگی کا اثر لباس مجاز میں
ہے فروغ روئے ایاز سے تپ و تاب سینۂ غزنوی — تپ و تاب سینۂ غزنوی کی لہک ہے روئے ایاز میں
یہ نماز صحن حرم نہیں یہ صلوٰۃ کوچہ عشق ہے — نہ دعا کا ہوش سجود میں نہ ادب کی شرط نماز میں
بدنام نہ کیوں ہو خم گردن یہ خودی کا — مارا ہے ازل سے تری سجدہ طلبی کا

جمیل نے اپنی غزلوں میں معاملات حسن و عشق، تشنگی، اور غم و یاس جیسے موضوعات کو بھی برتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی شاعری میں جو غالب رجحان ہے وہ فکری گہرائی کا ہے۔ بندے اور آقا کے درمیان تصادم جیسے موضوعات ان کی غزلوں میں موجود ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے غزلیہ متون میں محبوب کے لب و رخسار یا گیسوے خمدار ہی کا ذکر نہیں یا محض ہجر و وصال ہی کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے بلکہ مذکورہ بالا موضوعات ان کی غزلوں میں حاوی رجحان کے طور پر آئے ہیں۔ محبت اور عشق جو ایک آفاقی موضوع رہا ہے وہ روپ بدل بدل کر آتا رہا ہے۔ جمیل نے اپنے فن کو تازگی بخشنے کے لیے شاد عظیم آبادی، غالب، اقبال، اصغر وغیرہ سے اکتساب کیا ہے لیکن اپنی ایک الگ راہ نکالنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اختر اورینوی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''مظہری کبھی دوسرے کے پھیپھڑوں سے سانس نہیں لیتے۔ وہ تازہ کار و تازہ خیال ہیں'' [11]

جمیل کے دور اول کی غزلوں میں بھی ایک نکھرا ہوا اسلوب اور تراشیدہ و بالیدہ انداز ملتا ہے۔ رسمی اور روایتی ہونے میں بھی جذب دروں اور فن کی ہم آہنگی کی خوبصورت تصویر ابھرتی ہے:

کسی کا خون سہی اک نکھار دے تو دیا — خزاں کو تم نے لباس بہار دے تو دیا
اس تغافل پہ محبت کو ہنسی آتی ہے — جفا نام اسی کا تو جفا کچھ بھی نہیں ہے
خزاں اک کنایہ، بہار اک اشارہ — یہ سارا نظام اک تبسم تمھارا

قدم رکھتے ہیں اور پچھتا رہے ہیں   قیامت آرہی ہے، آرہے ہیں
وہ جاچکے ہیں اور آنکھوں پہ اعتبار نہیں   وہ آچکے ہیں مگر انتظار باقی ہے
سجدے میں جمیل آ گیا یہ کس کا تصور   ہونٹوں پہ نمازی کے دعا جھوم رہی ہے

جمیل کا پسندیدہ موضوع وحشت وخرد، تیرگی اور روشنی، ظلمت اور نور، گمرہی اور آگہی رہا ہے۔ یہ موضوعات ماورائی تصورات کے قریب ہیں۔ مابعدالطبعیاتی اور ماورائی افکار سے جمیل کو خاص شغف رہا ہے:

یہ اندھی تو ہمیشہ روشنی کو تیرگی سمجھی   کہوں کیا اپنی چشم منفعل کی خیرگی کو میں
ظلمت کی اور نور کی تخلیق تم نے کی   ہم کیا مٹائیں فرق سپید و سیاہ کا
ہوگیا حجرۂ تاریک یقیں بھی روشن   کوئی تو شک کا دیا لے کے وہاں تک پہنچا

مری گمرہی سے رستے مری خستگی سے منزل   مری داستاں مرتب مرے نقش ہائے پا سے
غریب شمع کے جینے کا اب سوال ہے کیا   کہ تیرگی کا سہارا تھا تیرگی نہ رہی
کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے   ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے

خرد اِنھی سے بناتی ہے رہبری کا مزاج   یہ تجربے جو میسر ہیں گمرہی سے مجھے

اوپر جو بھی اشعار پیش کیے گئے ان میں جمیل نے جن مشاہدات اور خیالات کو پیش کیا ہے، وہ سامنے کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک شعر میں خدا سے سوال ہے کہ ظلمت ونور کی تخلیق خدا ہی نے کی ہے۔ ایسے میں سپید وسیاہ کا فرق مٹانا مشکل ہے۔ اس میں انسان کی بے بسی اور خدا کے خالق ہونے کا اعتراف بھی ہے اور اس شعر میں کہ:

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے   ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے

یعنی یہ کہ میں تیرگی پسند نہیں ہوں بلکہ روشنی تو مجھے بھی پسند ہے لیکن پتنگوں نے مجھے روشنی سے ڈرا دیا ہے یعنی پتنگے روشنی (شمع) پر جان نچھاور کردیتے ہیں یا یوں کہیں کہ روشنی کے پاس جو ہوتا ہے اسے اپنی جان گنوانی پڑتی ہے، یہی سوچ کر میں تیرگی میں بیٹھا ہوں۔ سارے اشعار پر اظہار خیال کی یہاں گنجائش نہیں۔

جمیل کا خاص موضوع فکر وفلسفہ یا مابعدالطبعیاتی مضمون رہا ہے۔ لیکن انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ متصوفانہ یا مابعدالطبیعیاتی مضمون کی پیش کش میں ابتذال یا سطحیت پیدا نہ ہو۔ وہ غالب کی ذہنی افتاد کے بہت قریب ہیں، لیکن ان کے ڈھول دھپہ والے رنگ شاعری سے خود کو بچائے رکھا ہے البتہ یہ رنگ جمیل کی ہجو یہ شاعری میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ فکری بلندی کے اشعار دیکھتے ہیں:

کچھ بھی نہیں ہے عالم ذرّات سے آگے   اک عالم ہو عالمِ اصوات سے آگے
ملتے ہیں سماوات سماوات سے آگے   ہر گام حجابات حجابات سے آگے
نئے فتنے جگاتا ہی رہا ذوقِ نیاز اپنا   حقیقت نے مگر پھینکا نہ ملبوسِ مجاز اپنا
اتر رہا ہوں بہ تدریج آسمانوں سے   بلا رہا ہے تقاضائے آب و گل مجھ کو
ساری یہ جلوہ گری تیرے حجابات سے ہے   بے حجابی میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
بے بسی نے مری جھنجھلا کے جسے چاک کیا   تھا وہ اپنا ہی گریباں مجھے معلوم نہ تھا
حقیقت میں نہ جلوہ ہے نہ پردہ   مجھے تو اک تماشا سا لگے ہے
گرچہ تاریکی خلا اندر خلا ہے تا بہ عرش   کچھ نشانِ نقش پائے منفعل ملتا تو ہے

جمیل کو خود بھی اندازہ تھا کہ ان کی شاعری کی تفہیم وتعبیر ہر کس وناکس کے بس کی نہیں۔ انھیں اپنی شاعری کے Metaphysical Approach کا اندازہ تھا، اس لیے کہا تھا۔

سمجھیں گے وہی ذہن جمیل اپنے سخن کو   جاتی ہے نظر جن کی طبیعات سے آگے

تصوف جو اردو غزل کا مقبول موضوع رہا ہے، جمیل نے بھی اسے طرح طرح سے پیش کیا ہے۔ آئینہ، عکس، عکاس، پردہ، حجاب، جلوہ، لباس بدن وغیرہ استعمال کرکے اپنے متصوفانہ افکار پیش کیے ہیں۔ چند اشعار:

عالم تمام شعبدۂ کائنات ہے   اک شدتِ گماں ہے نہ دن ہے نہ رات ہے
پردہ وہ اٹھایا تو پردہ ہی نظر آیا   جب کچھ نہ نظر آیا تو کیوں نہ ٹھہر جاتے
نہ وہ زمین میں ہے اور نہ آسمان میں ہے   ہے لامکاں کوئی منزل تو لامکان میں ہے
من و تو کا پردہ ابھی درمیاں ہے   تجلّی ہے لیکن، تسلی کہاں ہے
کیا جواب اس کا ہو آئینے کی حیرت سے سوال   خود ہی حیران ہے آئینہ بنانے والا
مرا کیا ذکر تم سے بھی نہ اٹھا   من و تو کا جو پردہ درمیاں تھا

شوق ابھی حیرتیِ شمس و قمر ہے اے دوست　　　ابھی پردے کے اسی پار نظر ہے اے دوست

عکس و عکاس کے رشتے میں الجھتے ہیں جو ذہن　　　آئینہ کہتا ہے میری بھی حقیقت سمجھو

سمجھے ہو کہ اب تک ہے حقیقت پسِ پردہ　　　لیکن جو یہ پردہ ہی حقیقت ہو تو کیا ہے

عالم آرائے نظر کون ہے پھر　　　ہم اِدھر ہیں تو ادھر کون ہے پھر

اس کی ہستی ہے جدائی سے نمایاں یعنی　　　موت قطرے کی ہے دریا میں فنا ہوجانا

ہستی ہے جدائی سے اس کی جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا میں نہ تھا تو قطرہ تھا دریا میں ملا تو کچھ بھی نہیں

مذکورہ بالا اشعار ’آثارِ جمیل‘ اور ’فکرِ جمیل‘ دونوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ اشعار کا انتخاب کرنا اپنے آپ میں ایک مشکل کام ہے۔ جہاں تک تصوف کی جہتوں کا سوال ہے جمیل یہ سمجھتے ہیں کہ قطرے کی حیثیت دریا میں ضم ہوجانے سے پہلے تک ہی ہے۔ کبھی وہ مجاز کو حقیقت کے برابر تو کبھی بالکل الگ تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کی گنجائشیں موجود ہیں۔ اس حوالے سے ان کا مطمحِ نظر کچھ یوں ہے:

> ’’جہاں تک مسائل وحدت الوجود کا تعلق ہے میں ہمہ اوست اور ہمہ از وست دونوں کا قائل ہوں۔ ہمہ اوست ذات انسان اور ہمہ از وست انسان اور جملہ مخلوقات سماوی و ارضی ہیں، لیکن یہ گمان ہنوز تشکیک کی منزل میں ہے کیوں کہ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں اور شدّت سے سوچتا ہوں کہ اگر ذات انسان سے جداگانہ ایک خدائے قادر مطلق کا تصور بھی اس کے پاس نہ ہوگا تو یہ مظلوم و محروم ازل، مایوسیوں اور محرومیوں کا مارا ہوا انسان اپنی نامرادیاں اور ناکامیاں لے کر کدھر جائے گا۔‘‘ 12

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جمیل خدا کے تصور سے متفق ہیں اور اسے بجا طور پر تسلیم کرتے ہیں لیکن ان کی شاعری سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان جو کشیدگی اور تصادم کی ایک صورتِ حال نظر آتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل مضطرب کسی ایک فکری مرکز

پر ٹھہرنے کو تیار نہیں۔ اقبال کا فلسفۂ خودی مختلف نظریات اور متصوفانہ نکات کا نچوڑ ہے۔ جمیل نے خودی کا لفظ تو لیا لیکن اقبال نے جو مفہوم لیا ہے، جمیل نے اس سے بالکل الگ معنی میں استعمال کیا ہے۔ جمیل کے یہاں خودی غرور اور انا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جمیل نے جو بھی تصوف کے اشعار کہے ہیں ان میں فکری انضباط کے بجائے ایک طرح کی سیمابی و اضطراری کیفیت نظر آتی ہے۔ انھوں نے انسانی عظمت اور حرکت و عمل کے فلسفے کو اپنا لیا لیکن مردمومن کے تصور سے دامن بچا گئے کیوں کہ جمیل کو پتہ تھا کہ اگر ’مردمومن‘ کے تصور کو اپنایا تو پابندیاں بڑھ جائیں گی۔ تصوف یا مابعدالطبعیاتی فکر کے ذیل میں جو بھی اشعار پیش کیے گئے ان میں جمیل کا ذہنی رویہ زیادہ کام کرتا نظر آتا ہے۔ اس میں جمیل کا مجاہدہ یا خدا کے سامنے خودسپردگی کا جذبہ کم کم ہی نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے تصوف کے موضوع کو مختلف پیرائے میں اور مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ بندے کی اضطراری کیفیت کو پیش کرنے میں اس نوع کے اشعار کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔

جمیل مظہری کو خود بھی احساس تھا کہ شاعری میں ان کی افتادِ طبع روش عام سے قطعاً الگ ہے۔ اسی لیے انھوں نے خود ہی کہا تھا۔

خلاف رسم تغزل غزل سرا ہوں میں

اردو غزل کے متون میں جمیل کے متن کی شناخت بہت مشکل نہیں۔ البتہ دو شعرا کے متون جمیل کے متن کی تہوں سے جھانکتے ضرور ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان دو بڑے فنکاروں کے تخلیقی حسن کا پرتوِ لطیف جمیل کی غزلوں پر نظر آتا ہے——اور وہ بڑے تخلیقی فنکار ہیں غالب اور اقبال۔

جمیل مظہری کی غزلوں میں محض زندگی کی ترجمانی ہی نہیں بلکہ ان کا پرخلوص جذبہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ غزل میں سحر آفرینی محض کہانی یا تجربہ بیان کرنے سے پیدا نہیں ہوتی۔ خون جگر اور پرواز تخیل کی ہم آہنگی سے جمیل مظہری کا رنگ تغزل ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

میری لالہ کاری نے خار و خس کی دنیا میں　　　اجنبی بہاروں کو آشنا بنایا ہے

سن میرے دل کی دھڑکنیں میری خودی کے رازداں　　　میرا مذاق شاعری ہے میری روح کی فغاں

غزل کہنا ایک نازک فن ہے، مصوری ہے، آرٹ ہے۔ لہٰذا جمیل اپنی غزلوں میں اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

جمیل اپنی سخنوری بھی فسوں گری ہے، مصوری ہے
بنا کے تصویر مہ جبینوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا

یہ مہ جبینوں کی تصویریں بنانے کا کام ان کی غزلوں میں بہت ہوا ہے۔ ایک چلتا پھرتا محبوب بہت ہی مستحکم انداز میں ان غزلوں میں نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جو شوخی ہے وہ چشم ناز سے اکتساب کردہ ہے۔ اس نوع کے چند اشعار دیکھیے:

حسن اور عشق کی آشفتہ مزاجی کا لحاظ — زلف شانوں پہ بکھرتی ہے بکھرنے دیجیے
حسن بیباک نگاہوں سے پریشاں ہے جمیل — ایک سہمی ہوئی شوخی ہے حیا کچھ بھی نہیں
میں صدقے تجھ پہ ادا تیرے مسکرانے کی — سمیٹ لیتی ہے رنگینیاں زمانے کی
نگہِ شوق ترے پردۂ محمل پہ گراں — نگہِ شوق پہ ہے پردۂ محمل بھاری

لیکن جمیل کا محبوب ان کے لیے سوہانِ روح سے کم نہیں۔ یہ شوخی اور شگفتگی بہت جلد ماند پڑ جاتی ہے اور پھر عشق میں نالہ و فریاد اور افسردگیِ دل کا قصہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک ناآسودہ کردار بھی عاشق کی شکل میں ابھرتا ہے اور پڑھنے والوں سے کچھ اس انداز میں ہم کلام ہوتا ہے:

اے موسم گل تجھ سے ہم سادہ مزاجوں نے — گل پیرہنی مانگی، خونیں کفنی پائی
دیکھنے والوں نے سمجھا مری منزل اس کو — میں جہاں بیٹھ گیا حسرتِ منزل لے کر
کچھ ڈھیر راکھ کے ہیں، کچھ اَدھ جلی سی لکڑی — آیا تھا اک مسافر صحرائے زندگی میں
کل رات نبض فطرت کچھ تیز چل رہی تھی — دو دل دھڑک رہے تھے جنگل کی خامشی میں
سچ تو یہ ہے کہ وفا بھی ہے تھکن کا احساس — نگہِ شوق کو میں گرم سفر رکھ نہ سکا

یاس اور اضمحلال میں جمیل کو اس بات کا اندازہ ہے کہ خون آرزو سے ہی فن پر شباب آتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

جمیل کا سوز ناتمامی لطیف جذبوں کی تشنہ کامی
یہی تو وہ خون آرزو ہے جو رنگ بھرتا ہے شاعری میں

جمیل نے اپنی غزلوں میں جام و سبو اور حسن و عشق کے موضوع کو بھی طرح طرح سے برتا اور پیش کیا ہے۔ تشنگی اور سراب جیسے متضاد موضوعات بھی آئے ہیں۔ انھوں نے ان سے اپنی شاعری اور

جذب دروں میں ایک طرح کی خوبصورت ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اس شاعر میں یہ قوت ہے کہ وہ سراب کا دل بجھا سکے یا پھر یہ کہ رحمت پروردگار سے پیاس بجھنے کے بجائے سراب مل جائے۔ کہیں عشق تشنگی بنتا ہے اور حسن ایک سراب۔ اس نوع کے اشعار دیکھیے:

جہاں کہ تشنہ لبی پی رہی ہے خونِ جگر — وہاں تم آئے ہو پانی پیے وضو لے کر
سیرابیاں جمیل کو اتنا نہ دے سکیں — جتنا کہ فیض یاب ہوئے تشنگی سے ہم
اب کھلا کہ روح پر شوق اک عذاب تھا — عشق ایک تشنگی، حسن اک سراب تھا
اب اور خضر سے کیا چاہتی ہے پیاس مری — سراب رحمت پروردگار دے تو دیا
اک بوند نہ پانی کی پائی ہر چند سوئے دریا بھی گیا — دنیا میں جمیل آیا پیاسا پیاسا ہی رہا پیاسا ہی گیا

اس طرح عشق کے موضوع کو جمیل نے کئی رنگ دیے ہیں۔ اردو غزل کا یہ پسندیدہ اور مقبول ترین موضوع رہا ہے۔ ایک عام شاعر اسے کسی اور طرح پیش کرتا ہے لیکن جمیل جو کہ ایک فلسفیانہ ذہن رکھتے ہیں، ان کے یہاں یہ موضوع کچھ یوں آتا ہے کہ ہمیں کئی جہتوں کی طرف لے جاتا ہے:

کسی دن اے غرور عشق عرض مدعا کر دے — مزاج حسن کو تھوڑی سی بے چینی عطا کر دے
اک شعلگی سی روح میں تا زندگی رہی — وہ بھی مگر مزاج محبت نہ ہو سکی
ترا حسن بھی بہانہ مرا عشق بھی بہانہ — یہ لطیف استعارے نہ سمجھ سکا زمانہ
عقل اور عشق میں مدت سے ہے اک حالت جنگ — اور مرا دل نہ ادھر ہے نہ ادھر ہے اے دوست
سنا ہے دین و دانش ہو چکے حلقہ بگوش اس کے — خرد بھی عشق کے سانچے میں ڈھل جاتی تو اچھا تھا
عشق سمجھا یہ کہ جو کچھ تھا وہ ظاہر ہوگیا — عقل سمجھاتی رہی جو کچھ ہے اب تک راز ہے
عقل نے عشق کی منطق سیکھی — حامیِ شورش جذبات ہوئی
وہ عقل کا اک تجربہ تھا کہ جس نے شیشے کو سنگ سمجھا — یہ عشق کا اک واہمہ ہے کہ سنگ میں شیشگی ملے گی
محبت کا شعوری ارتقا یوں بھی تو ممکن ہے — کہ چاک اپنا گریباں ہو نہ زلف ان کی پریشاں ہو

اوپر کے اشعار کی Paraphrasing کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے مفاہیم قارئین پر واضح ہیں۔ عقل اور عشق کا جہاں تک تعلق ہے جمیل کے یہاں اقبال سے بالکل الگ نظریہ ہے۔ اقبال کو سنیے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

جمیل کہتے ہیں:

عقل نے آنکھیں کھول دیں ورنہ عشق تھا اندھا، اندھا ہوتا
عقل جویائے حقیقت چند زینوں تک گئی عشق محرومِ حقیقت پہلی سیڑھی سے گرا

یہی وجہ ہے کہ عشق اور اس کے جملہ مضمرات کو اقبال نے سمیٹ کر فلسفے کی اور منضبط نظریے کی شکل دے دی جب کہ جمیل کے یہاں عشق انتشار کا شکار رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ عشق کے انداز اور سوز و ساز میں جمیل نے بھی کوئی کمی نہ کی۔ دراصل جمیل کا عشق دوسرے بہت سے ثقہ شعرا سے بالکل منفرد ہے۔ اختر اورینوی کے بقول:

> ''جمیل مثالیت پرست ہیں اور ہمیشہ ناآسودہ-حسرت منزل اور ذوق ونظر کا سفر مدام ان کی رفعت کا باعث ہے۔ ان کی افتادِ طبع میں نالہ فرسائی ہے۔ ان کی محبت ناک فطرت انھیں عشق کی رسمیت سے پرے لے جاتی ہے۔ ان کا شوق ناتمام انھیں محروم ابدی بناتا ہے۔... وہ 'پرستارِ تجلی' نہیں، 'خریدار بصیرت' ہیں۔'' 13

جمیل کی غزلوں کا یہ رنگ دیکھیے جن سے اندازہ ہوگا کہ ان کی جبلی اور ذہنی افتاد کا تقاضا کیا رہا ہے؟

دیکھنے والوں نے سمجھا مری منزل اس کو میں جہاں بیٹھ گیا حسرت منزل لے کر
انجمن کا رنگ پھیکا، شام کا چہرہ اداس اک نگاہ یاس کا ہر سو اثر پھیلا ہوا
بہت مشکل ہے پاس لذت درد جگر کرنا کسی سے عشق کرنا اور وہ بھی عمر بھر کرنا
اے مسافر ترے ماتھے پہ شکن آ ہی گئی تو نے اک خار بھی تلوے میں گوارا نہ کیا

جمیل کی غزلوں کے ابھی اور بھی بہت سے Shades اور جہات ہیں جیسے جام وسبو اور غم و یاس وغیرہ۔ جام وسبو اور غم و یاس کے حوالے سے جمیل کے یہاں اشعار کی کمی نہیں، بلکہ خمریات کا ایک باب الگ سے قائم ہوسکتا ہے۔ پھر یہ کہ رند و پارسا، ساقی اور میکش، واعظ اور ناصح کے کردار میں انھوں نے بہت سے سیاسی وسماجی نکات سمونے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زندگی میں تشنگی اور افسردگی کا ایک بڑا پر معنی حوالہ رہا ہے جس کے سبب تشکیک نے بھی جنم لیا اور ان کے اندر ایک طرح کا مضطرب دل دھڑکنے لگا۔ گوشت پوست کی جس محبوبہ کا چہرہ ان کی نظموں میں کھلے طور پر نظر آتا ہے، وہ چہرہ ان کی غزلوں میں دکھائی

نہیں دیتا۔ ان کی غزلوں میں ان کے فکری ارتعاشات اور ٹھوس زندگی کی شیرینی کے بجائے غالب رجحان کے طور پر تلخی حیات نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں میں طربیہ رنگ کم ہی نظر آتا ہے، اس کی جگہ بیشتر مقامات پر غزلوں میں وہ نشتریت ملتی ہے جو انسانی احساسات کی دُھند کو چھیدتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہوا ہے کہ یہ سب کچھ تصنع سے خالی ہے، بلکہ یوں کہیں کہ انھوں نے جو کچھ بھوگا ہے اور زندگی کے جس رنگ کو دیکھا اور جیا ہے اسی کو شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ فطری شاعری اور ہوتی کیا ہے؟ حکمت اور فلسفے کو، گہرے فکری رموز کو یا پھر اپنے باطن میں اٹھ رہے عشقیہ ہیجان و جذبات کو کچھ اس انداز میں پیش کرنا کہ شاعری سے نغمگی اور موسیقی پھوٹنے لگے، جمیل مظہری کی غزلیں اس کی گواہ ہیں۔ اس سے ان کے ضبط نفس اور قدرت کلام دونوں کا پتہ چلتا ہے۔

مرثیہ نگاری

اردو میں مرثیہ نگاری کی روایت بہت ہی مستحکم رہی ہے۔ انیس و دبیر کے مراثی کا ایک بڑا سرمایہ اردو شاعری میں قیمتی اثاثہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

میں مرثیے کو قصیدے کی نقیض سمجھتا ہوں۔ اوّل الذکر غم والم کے لیے مختص ہے تو آخر الذکر مدح سرائی کے لیے۔ اردو میں قصیدے کی روایت پرانی ہے۔ مرثیہ اس کے بعد آیا۔ انیس سے پہلے بھی مرثیہ نگاری ملتی ہے مگر انیس نے اسے فکر و فن کی جس بلندی پر پہنچایا، ابھی تک اس سے آگے یہ فن نہیں جا سکا ہے۔ البتہ مرثیہ نگاری جاری رہی ہے۔ چوں کہ یہ ایک بیانیہ صنف شاعری ہے اس لیے جس شاعر کا ذہن نظمیہ متون سے ہم آہنگ ہوتا ہے وہی اس صنف کو بخوبی نبھا سکتا ہے۔ جمیل مظہری نے اردو نظم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ لہٰذا قصیدے بھی کہے، مثنویاں بھی لکھیں اور مراثی بھی۔

مرثیہ نگاری کی پوری روایت جمیل مظہری کے سامنے رہی ہے۔ انھوں نے شاعری کی اثرانگیزی اور اس کے تقاضے کو خوب سمجھا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں، مراثی اور قصائد میں اور اسی طرح غزلوں میں بھی الفاظ وتراکیب کے برتے جانے پر خصوصی توجہ کی ہے۔ قصیدوں اور مرثیوں میں الفاظ کے دروبست کی اہمیت پر انھوں نے خاص توجہ کی ہے۔ انیس نے بھی اپنے مشہور مرثیے: 'نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری' میں چار پانچ بندوں میں شاعری اور اس کے اہم اجزا کی اثرانگیزی اور ان کے برتے جانے کے سلیقے کو پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے جمیل مظہری نے بھی اپنی مثنوی شام غریباں (81 بند

1963) میں تقریباً دس بندوں میں شاعری کے اوصاف بیان کیے ہیں:

شاعری بحرِ معانی کا تلاطم ہے جمیل　　جس پہ غلطاں ہیں ستارے یہ وہ قلزم ہے جمیل
رنگ و بو کے جو کنایوں میں خرد گم ہے جمیل　　شاعری اس پہ حقیقت کا تبسم ہے جمیل
اہل دانش ہے وہی اہل بصائر ہے وہی
اس تبسم کو جو پہچان لے شاعر ہے وہی

مجھ کو تسلیم ہے الفاظ کی دارائی بھی　　دے اگر دیدۂ ادراک کو بینائی بھی
اس کی تاثیر میں شدت بھی ہو گیرائی بھی　　اس میں وسعت بھی ہو رفعت بھی ہو گہرائی بھی
شاعری کیا جو سخن ولولہ انگیز نہ ہو
ہاں مگر خوانِ تکلم میں نمک تیز نہ ہو

بوئے گُل زورِ خطابت سے بگولا نہ بنے　　داغ پیشانی کا خالِ رخِ زیبا نہ بنے
نالہ آہنگ میں نالہ رہے نغمہ نہ بنے　　نغمہ شوریدگیِ لحن سے نالہ نہ بنے
لفظ و معنی میں توازن ہو سُر اونچا نہ اٹھے
آنچ جذبات کی دھیمی رہے شعلہ نہ اٹھے

آگے چل کر جمیل نے غالب، وحشت، چکبست، میر، مومن، آتش، سودا، انیس اور پھر پیر رومی، عرفی شیرازی، اقبال اور شاد کے حوالے سے اپنی شاعری میں جذبے کی گداختگی اور حرارت کی طلب کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمیل مظہری مرثیے میں صرف ماجرا نگاری یا واقعات کے بیان کو اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس بیان میں شعری لوازم کی پاسداری کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔

جمیل مظہری کے مراثی میں قومی مقاصد حاوی طور پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے خود تسلیم کیا ہے کہ ان کا پہلا مرثیہ عرفانِ عشق 1930، ترقی پسند تحریک اور مولانا آزاد کی تقاریر سے متاثر ہو کر کہا گیا تھا (سہیل گیا جمیل مظہری، ص 18)۔ پتہ نہیں 1930 کو ترقی پسند تحریک سے کیسے جوڑا گیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا باضابطہ آغاز ہی 1936 میں ہوا تھا۔

ان کے مرثیے 'لمحہ غور' کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قومی و ملی جذبات کے مانند پڑ جانے اور انھیں زندہ کرنے کی بات کر رہے ہیں، مرثیہ کے اوّل دو مصرعے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جمیل

مرثیے کے پردے میں اور کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں:

آج دنیا میں نہ شب ہے نہ سویرا ہے جمیل
کچھ سیاست کے کہا سوں نے بھی گھیرا ہے جمیل

دراصل یہی ہے جدید مرثیہ نگاری کی پہچان۔

چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ فکر و نظر کی دنیا بھی اندھیرے میں ہے۔ تارے بھی مفلس کے دیے جیسے ہیں۔ یہاں شمع تو کیا، جگنو بھی نہیں ہے۔ کیا مساجد اور کیا منادر، سب میں تاریکی ہے، سخنور، مدبر، حکیم و مفکر سب کے دل و دماغ اندھیرے میں ہیں۔ جمیل کی نظر ہر گوشۂ حیات کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے اور بجا طور پر دیکھتی ہے:

منہ پہ اوڑھے ہوئے ہے ذوقِ نظر اندھیاری　　جنس بازار ہیں دانشوری و دینداری
ہے کوئی تاجرِ زُہد اور کوئی تاجرِ فکر　　عقل عیار تھی اب عشق بھی ہے عیاری

جمیل نے مرثیے میں تعزیہ اور نوحہ کرنے والوں پر کہیں کہیں طنز بھی کیے ہیں۔ اسی مرثیے کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

مجلسیں بھی نہ بنیں مدرسۂ بیداری　　وہی افسانہ گری اور وہی افسوں کاری
تعزیوں کا یہ تجمل یہ جلوسوں کا شکوہ　　اور یہ زنجیروں کی جھنکار میں ماتم داری
سوچو! کیا تم نے دیا دیدۂ بینا کے لیے
ہاں تماشا تو بنے چشمِ تماشا کے لیے

اردو میں شخصی مرثیے بھی لکھے گئے لیکن اصل مرثیے کا اطلاق شہدائے کربلا کے حوالے سے کہے گئے مرثیے پر ہی ہوتا ہے۔ جمیل نے اور وحید اختر نے قدرے اجتہادی اقدام کرتے ہوئے مرثیے میں سیاسی، سماجی اور عصری حسّیت کے عناصر کو بھی شامل کیا ہے۔ جوش نے بھی 'آوازۂ حق' میں انقلاب کی دعوت دی۔ جمیل کے مرثیے 'پیمانِ وفا' میں آزادی کے جذبے کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ قابلِ غور ہے، اور اسی سبب بہت سے روایت پرست لوگوں کو جمیل کی یہ روش پسند نہیں۔ یا انھوں نے ہندوستان کی خستہ حالی کو جس طرح پیش کیا ہے، اسے دیکھ کر لوگوں نے اسے مرثیے کی روایت سے الگ تصور کیا:

جائے عبرت ہے ترے حال پہ قومِ مغفور　　رخ پہ نکبت کا اثر، دل میں غلامی کا سرور

نہ اخوت کی تڑپ ہے نہ سیاست کا شعور   نہ خرد ہے، نہ جنوں ہے نہ حیا ہے نہ غرور
زندگی میّتِ احساس ہے، دل مردہ ہیں
جتنے جذبات ہیں قومی وہ سب افسردہ ہیں   (پیمانِ وفا)

حقوق کی پامالی یا تہذیبی شکست وریخت کا نقشہ انھوں نے مرثیے میں پیش کیا:

ہے حکمران عقل پہ دولت ابھی تلک   ایماں کی ہورہی ہے تجارت ابھی تلک
جاگیر اہرمن کی ہے جنت ابھی تلک   ابلیس ہے معلمِ فطرت ابھی تلک
پامالیٔ حقوق کا تہذیب نام ہے
انسانیت کی روح کا اک قتل عام ہے   (مضرابِ شہادت)

شاید اسی سبب مظہر امام نے بھی لکھا ہے کہ:

''جمیل مظہری نے اپنے مرثیوں میں نوحہ و ماتم سے زیادہ واقعۂ کربلا کے تاریخی مضمرات کو پیش نظر رکھا ہے اور شہدائے کربلا کے ایثار و قربانی، ان کی بلند حوصلگی اور حق وصداقت اور اصول پروری کے لیے جاں سپاری کے جذبے کو زیادہ اہمیت دی ہے۔'' 14

اوپر کے اقتباس میں جو توجیہات پیش کی گئی ہیں وہ بجا ہیں کہ آج کے دور میں مرثیہ نگاری کی معنویت اور اہمیت کا جواز بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ بلکہ ایسے میں جمیل مظہری پر رومانیت اور تشکک کے الزامات بھی ماند پڑجاتے ہیں۔ ساتھ ہی اس تناظر میں انسانی اور سماجی سروکار سے مرثیے کا رشتہ استوار ہوجاتا ہے۔ مراثی میں آکر ان کا تمام تر فکری انتشار مربوط و منظّم کیسے ہوجاتا ہے۔ کیا یہ شہدائے کربلا کی محض برکتیں ہیں یا اس میں ان کا ذاتی عمل دخل بھی ہے؟ ایک ایسی بانسری کی آواز ہے، جس کی لے میں نشتریت اور موسیقیت مل کر معجز بیانی کی فضا قائم کررہی ہے۔ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین، جس چیز کا ذکر کریں ایک ایسے فکری نشاط انگیز لمحے کا احساس ہوتا ہے جس کی تخلیق انتشار کے عالم میں یا تشکیک زدگی کی صورت میں ممکن نہیں ہوسکتی۔ حضرت زینب کے حوالے سے یہ بند دیکھیے:

آپ کے حق کی قسم سیدۂ عالی جاہ   آپ کے صبر پہ فطرت کے مناظر ہیں گواہ
تیرگی شام غریباں کی وہ انا للہ   اور وہ تپتے ہوئے صحرا کا سکونِ جانکاہ

سب یہ کہتے ہیں کہ راضی بہ رضا تھیں زینب
فاتحِ معرکۂ کرب و بلا تھیں زینب   (اربابِ وفا، 1956)

جمیل کے مرثیوں میں رجز کا منظر بھی پرجوش ہوتا ہے۔ صرف دو بند اس حوالے سے دیکھیے جس میں 'رجز' کے نقوش ہیں اور جو حضرت عباس کی بہادری اور جاں سپاری کو ظاہر کرتے ہیں۔ جوش اور جذبے کے اضطراب اور قوت بازو کو جس طرح جمیل مظہری نے پیش کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ ان کی قوت تخلیق اور فکری علویت کی ہم آمیزی دیکھی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی جس طرح جمیل نے شعری استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے، اس سے بھی ان کی خلاّقانہ قوت اور فنی بصیرت ظاہر ہوتی ہے:

نیزہ نہ تھا وہ آتش و آہن میں ساز تھا   سب سرنگوں تھے ایک وہی سرفراز تھا
نیزہ نہ تھا، جبینِ مشیت کی تھی شکن   نیزہ نہ کہیے موت کا دستِ دراز تھا
نیزہ نہ تھا، نہنگ تھا لوہے کی جھیل میں
کہیے عصا کلیم کا، دریائے نیل میں
پھٹنے لگے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر   بکھرے ہوئے سروں کے تھے جنگل اِدھر اُدھر
لاکھوں ہیں اور ہوش کسی کے بجا نہیں   بھگدڑ یہاں وہاں ہے تو ہلچل اِدھر اُدھر
کہتی تھی عقل گوش ہر ایماں فروش میں
بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش میں   (علمدار وفا 1975)

نیزے کو جبینِ مشیت کی شکن، نیزے کو لوہے کی جھیل میں نہنگ اور دریائے نیل میں عصائے کلیم کہا گیا ہے۔ نیزے کی نوک کو آیت ربّ جلیل کہنا ایک نازک تشبیہ ہے جس سے فطری طور پر ایک چمک سی پیدا ہوجاتی ہے۔ ڈھالوں کے بادل کا پھٹنا اور سروں کے جنگل کا استعمال جمیل مظہری کی قوت پیکر تراشی کو نشان زد کرتا ہے۔

اس مرثیے میں انھوں نے تیسرے مصرعے کو قافیے کی پابندی سے آزاد رکھا ہے، ایسے اور بھی کئی مرثیے ہیں۔ ساتھ ہی اپنی طویل نظم اثر فریاد (جواب فریاد) میں بھی اسی طرح بند کے تیسرے مصرعے کو آزاد رکھا گیا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے جمیل کا یہ بھی ایک اجتہادی رویہ تھا۔ کئی نقادوں نے ان کے

غیر مربوط فکری رویے پر تنقیدیں بھی کی ہیں۔ ایسے نقادوں میں احمد سجاد اور عبدالمغنی پیش پیش ہیں۔ عبدالمغنی نے کئی جگہوں پر ان کے مرثیوں میں غیر منظم فکری روش کی نشاندہی کی ہے مگر دوسرے ہی لمحے یہ بھی لکھا ہے کہ تمہید اور موضوع کے مابین اتنی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ تمہید کے اشعار بالکل فطری طور پر موضوع کے اشعار میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ سب از خود ہو گئے ہیں؟ دراصل جہاں معنوی ربط کا فقدان نظر آتا ہے وہاں قاری کا ذہن یقیناً شاعر کی فکری پرواز کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ یوں بھی شاعری کو بالکل دو اور دو چار کی طرح آنکنا بہت مناسب نہیں۔ شاعر کو جہاں آزاد رہنا ہے وہ رہے گا، ہمارے آپ کے سینہ کوبی کرنے سے وہ اپنے پر پرواز فوراً سمیٹ نہیں لے گا۔ یہاں ڈاکٹر ہلال نقوی کا یہ موقف بھی ملاحظہ کیجیے:

''میرے نزدیک اس سے ابلاغ، کشادگی اور وسعت کی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ پھر جب آپ ہیئت پر بحث کر رہے ہیں تو آپ کو شاعر کے مزاج اور اس کے رنگ کو بھی پہلے سمجھنا ہوگا۔''15

جمیل کے چند تمہیدی بند ملاحظہ کیجیے جن میں معانی کی جہتیں اور منظر کشی کے عناصر واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں:

خم بہ خم کاکلِ ہستی کا فسانہ ہے عجیب — اس کے بننے کا بگڑنے کا بہانہ ہے عجیب
حیرتِ بے کسیِ آئینہ خانہ ہے عجیب — اک گرہ بھی نہ کھلی قسمتِ شانہ ہے عجیب
گتھیاں اور بھی بڑھتی گئیں سلجھانے سے
زلف الجھتی رہی کچھ بن نہ پڑا شانے سے (افسانۂ ہستی 1957)

کھولا عروس شب نے جو زلفِ دراز کو — خوابِ گراں نے پیار کیا چشمِ ناز کو
شعلہ بنایا نرگسِ جادو طراز کو — جھونکا دیا تخیلِ راز و نیاز کو
سر سے ردائیں ڈھل کے سرِ دوش ہوگئیں
انگڑائیاں تصورِ آغوش ہوگئیں (عزمِ محکم)

یہ محض منظر کشی نہیں دراصل مرثیے کے ایک اہم جز چہرہ کا حصہ ہیں۔ تمہید کے طور پر جو اشعار شروع

میں آئے ہیں انھیں 'چہرہ' کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ مسعود حسین رضوی نے 'روح انیس' میں لکھا ہے:

''صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے کے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت، مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر۔''16

مراثی میں منظر نگاری کا تعلق موضوع سے ہوتا ہے۔ صرف تفریحی شاعری نہیں ہوتی۔ اگر موضوع سے ہم آہنگی نہیں تو منظر نگاری بے معنی ہو جاتی ہے۔ منظر کشی کی ضرورت تو مرثیے میں قدم قدم پر ہوتی ہے۔ میدانِ کارزار کا ذکر ہو یا رجز کا، جنگ میں تلواروں کی تعریفیں ہوں یا گھوڑوں کی، نقشہ بین کا ہو یا زور آزمائی کا، ہر زاویے سے منظر کشی کرتے ہوئے جذبات کا خیال رکھنا اور آہنگ و اثر کو قائم رکھنا یہ ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ جمیل کی مرثیہ نگاری میں ایک سدھا ہوا اور پُر اثر اسلوب ملتا ہے۔ جمیل فضا بندی اور ماحول سازی کے لیے اس طرح نقشہ کھینچتے ہیں۔ گھوڑے کی تعریف میں یہ سراپا نگاری دیکھیے جس میں خوبیاں بیان ہوئی ہیں:

برق دم، برق قدم، صاعقہ زادے ان کے — ان کے گھوڑے کہ مجسم تھے ارادے ان کے
وہ طرارے کہ ہوا پاؤں تلک چھو نہ سکی — آسماں کچھ نہیں روندے ہوئے جادے ان کے
پاؤں پکڑے ہے زمیں سوئے فلک اڑتے ہیں
یہ فرس ہیں کہ خلاؤں میں ملک اڑتے ہیں
(حقیقت نور و نار، 1980)

گھوڑا ہے یہ نسیم نہیں ہے، صبا نہیں — لیکن مزاجِ برق بھی اتنا رسا نہیں
کہتا ہے کون یہ کہ فرس باوفا نہیں — دریا کو ہنہنا کے کبھی دیکھتا نہیں
ہر چند تشنگی کا جگر میں وفور ہے
صابر حضور ہیں تو فرس بھی غیور ہے (مضرابِ شہادت)

یہ دونوں بند ایک طرح سے مرقع کشی اور سراپا نگاری کے ذیل میں آسکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سراپا گھوڑے کا ہے۔ جمیل مظہری کو یہ ملکہ حاصل تھا اس لیے ان کے مراثی کامیاب اور دلچسپ ہیں۔ ان میں جا بہ جا ان کے شعری رویے اور فلسفیانہ رموز کے نقوش بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی تربیت نے بھی انھیں اس فن

مرثیہ نگاری میں کامیاب بنایا۔ان کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے محمد رضا کاظمی لکھتے ہیں:

''جمیل مظہری کی کامیابی ان کے شعوری نصب العین سے بالاتر ہے۔
وہ بالآخر نظم کے خارجی عناصر کو مرثیے کی روایت میں فطری طور پر
جذب کر گئے، دوم انھوں نے فلسفیانہ رزم آرائی کو مرثیہ میں سموکر
مرثیہ نگاری کے اس دبستان کا تتمہ کردیا جس کی داغ بیل اس مصرع
سے پڑی تھی ۔

ہاں اے نفس بادِ سحر شعلہ فشاں ہو 17ـ

نوحہ اور بین مرثیہ کا آخری جُز ہے جو بہت نازک بھی ہے اور اہم بھی۔ یہاں اگر صرف رونا دھونا ہو اور میدان کارزار میں اضمحلال اور یاسیت کی فضا قائم ہوجائے تو گویا یہ اہل بیت کی ہزیمت اور پست ہمتی کو واضح کرتی ہے۔اس لیے یہاں بین کرتے ہوئے بھی یہ خیال بہرحال رکھنا ہوتا ہے کہ اللہ کے بندوں میں جو ولولہ اور شوق شہادت یا ان کے جو حوصلے ہیں ان پر آنچ نہ آئے اور نہ وہ متاثر ہوں:

لاش تم دونوں کی مقتل میں پڑی ہے بیٹا   دن تو ڈھلتا ہے مگر دھوپ کڑی ہے بیٹا
چونکو غش سے کہ مصیبت یہ بڑی ہے بیٹا   آل احمدؐ پہ قیامت کی گھڑی ہے بیٹا
ذبح ماموں کو کریں بہنوں کے زیور چھینیں
وقت اب وہ ہے کہ اعداء مری چادر چھینیں

(افسانۂ ہستی، 1957، جناب عون ومحمد کے حوالے سے)

موت بچے کی مصائب کا شباب اے مولا   اس کا خوں ریشِ مقدس کا خضاب اے مولا
اپنے خیمے کی طرف بڑھ کے ٹھہر جاتے تھے   منتظر تھیں درِ خیمہ پہ رباب اے مولا
اپنے بچے کے قریب آکے جو پوچھا ہوگا
آپ نے کوکھ جلی ماں سے کہا کیا ہوگا   (لمحۂ غور)

ثریا جمال مظہری نے جمیل کے اس نوع کے بند پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

''گریہ وبکا کی فضا تخلیق کرتے وقت امام حسین یا ان کے اعزا احباب یا مخدرات
عصمت وطہارت کا ایسا کردار پیش نہ ہو کہ جس سے ظاہر ہو کہ مصائب وآلام نے ان

کے عزائم میں شکستگی و ماندگی پیدا کردی تھی اور آپ کے بین کا یہ بھی بڑا وصف
ہے کہ ان میں رقت ودلدوزی بھی خوب ہے۔'' 18ـ

جمیل مظہری جدید مرثیہ نگاری کے باب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے عصری حسیت کو بڑی ہی خوبصورتی سے اپنے مراثی میں جگہ جگہ سمویا ہے۔ڈاکٹر معید الرحمٰن کے بقول:

''جمیل مظہری اپنے عہد کی اقداری شکست وریخت کو واقعات کربلا
سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مختلف فنی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔کربلا
کے کردار، واقعات اور فضا کو کبھی علامت کے طور پر استعمال کرتے
ہیں، کبھی کنایہ کے طور پر اور کبھی استعارے کی سطح پر لا کر اپنے عہد کو
کربلا کا حصہ بنا دیتے ہیں۔'' 19ـ

جمیل مظہری کے مراثی پر ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں کام ہوا۔وہ جدید مرثیہ نگاری میں ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح ہیں۔زندگی اور کائنات، کربلا اور آلام روزگار کے ارتباط سے ان کے مراثی سے ایک ایسا منشور تیار ہوتا ہے جس کی روشنی میں اس صنف شاعری کا سفر آگے کی طرف رواں دواں ہوسکتا ہے۔آج اگر جدید مرثیہ نگاروں میں نام لیے جائیں تو سب سے پہلے، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری اور وحید اختر کے نام آتے ہیں۔

قصیدہ نگاری

اردو میں جمیل مظہری نے نظمیہ شاعری، مرثیہ نگاری، غزل گوئی، رباعی گوئی، مثنوی نگاری جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔اسی طرح انھوں نے قصائد بھی کہے ہیں جن کی بڑی قدر ومنزلت ہے۔ عرفان جمیل میں چھ (6) قصائد ہیں۔اس کے علاوہ بھی چھوٹے قصیدے ہیں۔زیادہ تر قصیدے در مدح سرکار کائنات کہے گئے ہیں، ایک قصیدہ حضرت علی کی شان میں ہے، ایک قصیدہ غالب اور ان کے ممدوح حضرت علی کی شان میں، ایک قصیدہ سبط اکبر حضرت امام حسنؑ کی مدح میں ہے۔ایک قصیدہ حضرت عباس کی شان میں ہے جو کہ انجمن اصغریہ، شدر یا الہ آباد کی سالانہ محفل 'عباس ڈے' کے موقعے پر دیے گئے مصرع طرح: جرأت شیر خدا عباس کی جاگیر ہے، پر 1977 میں کہا گیا تھا۔وجدان جمیل میں قصیدۂ نعتیہ (بطرزِ محسن کاکوروی)، نوائے بے نوائی (قصیدۂ دلائیہ) قصیدہ برائے جشن میلاد حسینی، قصیدۂ کربلا

(درمدح حضرت عباس و جناب زینب)، قصیدہ (بہ تعارف حقیقت منتظر) ہے۔ان قصائد کے موضوعات مذہبی کہے جاسکتے ہیں۔سارے مراثی بھی اپنے سامنے رکھیے اور دوسری ملی نظموں میں شب معراج، محسن انسانیت، رباعیات نعتیہ، ردائے زہراؑ، سجدہ، حسینی بچوں کا ترانۂ ملی، التجائے ارنی، استغاثہ وغیرہ کو ذہن میں رکھیے تو ان کے حوالے سے یہ نظریہ تقریباً رد ہوجاتا ہے کہ ان کا ذہنی وفکری میلان مذہبی نہیں تھا۔ہاں تشکیک سے تو ایک مذہبی شخص بھی دو چار ہوسکتا ہے۔

جمیل سودا، محسن کاکوروی، غالب اور ذوق کے قصائد سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔لہٰذا کئی قصائد ان اساتذۂ فن کی زمینوں میں ملتے ہیں۔انھوں نے غالب کے ایک قصیدے کی تضمین بھی کی ہے اور اُسی زمین میں الگ سے بھی ایک قصیدہ لکھا ہے۔

قصیدے میں جن پُرشکوہ الفاظ و تراکیب کی ضرورت ہوتی ہے، جمیل نے ان کا پورا پاس رکھا ہے جمیل کے ڈکشن کو کہیں کہیں غالب یا سودا سے الگ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔انھوں نے غالب کی تضمین جس خوبصورتی سے کی ہے، پہلے اس کے دو بند پیش کیے جاتے ہیں:

حرم و دَیر میں افلاسِ شریعت معلوم   وادیٔ وہم میں پاکوبیٔ حکمت معلوم
اور بے مائیگی لفظِ حقیقت معلوم   ''لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں''

کثرت آرائی نیرنگِ تصور وحدت   آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں جنت
حرفِ مطلب ہمہ رنگینیٔ الفاظ لغت   ''نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں''

مخمس کی ہیئت میں یہ قصیدہ کہا گیا ہے، تین مصرعے جمیل کے ہیں اور دو مصرعے غالب کے۔

جمیل نے مذکورہ بالا قصیدے میں صرف ڈکشن کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنی فکری ساخت کے مطابق اپنے جذبات پیش کیے ہیں۔نیاز فتح پوری نے انھیں غالب کا مقلد کے بجائے غالب کا نمائندہ کہا تھا۔تقلید سے بڑی چیز ہوتی ہے نمائندگی۔طالب جوہری نے یہ لکھا ہے کہ:

''غالب کی ترکیبوں پر مہارت حاصل کرنے کے باوجود جمیل کا قصیدہ صدائے بازگشت بن کر رہ جاتا اگر صرف غالب کے وجدان نے انھیں

دعوتِ سخن دی ہوتی۔ان کو غالب کے امکان نے متوجہ کیا اور وہ ایک ہموار معیار کا قصیدہ کہہ گئے جس کی فکری سطح غالب کے قصیدے کے برابر ہے۔'' [20]

غالب ہی کی زمین میں لکھے گئے قصیدے 'مداح وممدوح' پر رائے دیتے ہوئے مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''جمیل مظہری نے نہ صرف غالب کی زمین اختیار کی بلکہ اسی لہجے اور مزاج کو اپنے طویل قصیدے میں برت کر فنکارانہ چابک دستی اور قدرت کلام کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔کم وبیش ہر شعر ویسی ہی شاندار ترکیبوں سے مزین، الفاظ ویسے ہی تخلیقی استعمال سے مرتعش اور بلندیٔ فکر کی اُسی عظمت کا نمونہ ہے جو غالب کے مذکورہ قصیدے کے امتیازات ہیں۔'' [21]

غالب کی اسی مذکورہ بالا زمین میں دوسرا قصیدہ بھی ہے جو کہ رائج ہیئت میں ہے۔چند اشعار اس قصیدے سے بھی سنیے:

نہ وہ آلام محبت میں گمانِ لذت   نہ وہ میلانِ عبادت میں فریبِ تسکیں
نہ وہ فیضانِ تخیل نہ وہ اذعانِ ضمیر   نہ وہ نیرنگِ توہم نہ وہ وجدانِ یقیں
حیف ازیں جورِ تعقل کہ نہ عرفاں نہ شعور   تُف بریں خوئے توکل کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
(تشبیب اوّل سے)

بسکہ دشوار ہے اشیاء کی حقیقت کا سراغ   آسماں گرد نظر زنگ تصور ہے زمیں
عرش دیباچۂ تفصیلِ طلوعِ اسرار   فرش آئینہ ابہامِ ظہورِ خود بیں
پیکرِ شانِ خدا، مظہرِ آیاتِ جلیل   منبعِ علم ہدیٰ مرکزِ حق محورِ دیں
(تشبیب ثانی سے)

اس منقبتی قصیدے میں جمیل نے کائنات کے اسرار اور انسانی افکار کی تہی دامنی کو بھی پیش کیا ہے اور غالب کی تخلیقی عظمت کے لیے بھی چند اشعار کہے ہیں۔یہ بھی لائق توجہ ہے کہ جمیل نے کس طرح غالب کو دادِ سخنوری پیش کی ہے:

مرغِ تخئیل پہ گم ہے تری منزل کا سراغ   فلک العرش ہے اوروں کا جو ہے تیری زمیں
سلکِ مضموں ہے کہ آئینۂ حسنِ بندش   حسن بندش ہے کہ سرمایۂ عقد پرویں
تیرے اک شعر میں غلطاں ہمہ رندی ہمہ زُہد   تیرے اک جام میں رقصاں ہمہ دنیا ہمہ دیں
تیرے پیانے سے سرخوش ہے کمالِ دانش   تیرے آئینے میں حیراں ہے جمالِ خود بیں
ہر صنم تیری خدائی کا طلبگار سجود   تیرا دیوان ہے اک عالم بتخانۂ چیں
دیکھتے سب ہیں اس آئینے میں صورت اپنی   چہ تعقل چہ توہم چہ تحیر چہ یقیں

جیسا کہ پہلے ہی ذکر آیا ہے کہ بیشتر قصیدے درمدح سرورِ کائنات ہیں۔ حدیث دلبری، میخانہ کوثری، طلوعِ سحر، زمزمۂ عرفاں، قصیدۂ نعتیہ (بہ طرزِ محسن کاکوروی)۔ اس کے علاوہ قصیدہ ولائیہ اور حضرت حسینؓ اور حضرت حسن کی شان میں قصائد ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری ملی نظموں میں بھی جمیل نے اپنے جذبات کی پیش کش میں اسی شان وشکوہ کا اہتمام روا رکھا ہے۔

جمیل کے نعتیہ قصیدے بہ طرزِ محسن کاکوروی کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ محسن کاکوروی کے اس قصیدے پر چوں کہ ہندوستانی رنگ غالب ہے اس لیے جمیل نے بھی اسی رنگ کو نبھایا ہے، بلکہ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ قصیدہ محسن کے قصیدے پر فائق نظر آتا ہے۔ آیئے یہ منتخب اشعار دیکھتے ہیں:

پاٹلی پتر سے جائے سوئے متھرا بادل   پانی گنگا کا چھڑکتا ہوا جنگل جنگل
گوپیاں آج بھی دھارے ہیں پپیہوں کا روپ   پی کہاں کہتے ہیں جب وہ تو لرزتے ہیں کنول
رُت ہے برکھا کی برستا ہے جھما جھم پانی   موجِ صہبائے سخن اور اُچھل اور اُچھل

ہندوستانی موسم کی خوبیوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ جمیل کو فضا بندی میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اس قصیدے کے تمہیدی اشعار میں اپنی تخلیقی قوت کا خوبصورتی سے اظہار کیا ہے۔ فضا بندی کو کچھ لوگ محض خارجی عوامل سمجھتے ہیں، یہ ایک بڑی بھول ہے۔ اس کا موضوع سے معنوی انسلاک ہوتا ہے، اگر ایسا نہیں تو پھر منظر کشی یا فضا بندی واقعی ایک خارجی عمل ہے۔ جمیل کو لفظوں کے برتنے میں مہارت حاصل ہے اور تخلیقی وفور ہر نوع کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ہندی کے الفاظ برتنے میں انھیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا اور نہ تخلیقی حسن مجروح ہوتا ہے:

گلشن ہند میں بھادوں کا مہینہ ہے بہار   اسی موسم میں نکلتی ہے دلوں کی کُو پَل [22]

اسی موسم میں ابھر کر زدلِ کالی داس   پی کی نگری کو چلا لے کے سندیسہ بادل
رنگ سو طرح کے اک روپ کی پھلواری میں   اس کی دھانی ہے ردا اُس کا بسنتی آنچل

جمیل مظہری نے اپنے اس قصیدے میں امیر خسرو کو بھی خراجِ تحسین پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد مطلع ثانی میں نعت حضرت محمدؐ شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں حضرت محمدؐ کے افکار مقدسہ اور تعلیمات کی باتیں کی ہیں اور پھر ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا کو اور نفرت اور تفرقہ سازی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں عصری حسیت کے حد درجہ قائل تھے اور اس دعوے کے ثبوت میں ان کے مراثی میں ہم عصر سروکار کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ قصیدے میں آخر کے دعائیہ اشعار میں اپنے گہرے سچے جذبات کا اس طرح اظہار کیا ہے:

ساقیا ہے یہ تری مرحمت خاص کا رنگ   کہ خداخانہ و بت خانہ بنے ہیں دنگل
یہ ہوا کیا کہ خُم آشام ہوئے خون آشام   نظمِ میخانہ بدل قسمتِ پیمانہ بدل
ساقیا زمزم و گنگا خُمِ رحمت کا ابال   آج پھر اس خم رحمت سے یہ کہہ دے کہ اُبل
سارے بھارت میں بہے پیت کا رس گیت کا رس   لہلہا جائیں بیابان و خیابان و جبل

جمیل کا جو تشکیکی مزاج ہے وہ ہر جگہ نظر آ جاتا ہے۔ خواہ وہ کسی صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہوں، جہاں موقع ملا وہی راگ الاپنے لگے، گویا یہ ان کے مزاج کا ناگزیر حصہ ہے۔ ایک قصیدہ نوائے بے نوائی (قصیدہ ولائیہ) ہے جس کے شروع کے تیس بتیس (30,32) اشعار اسی کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔ ایک طرح سے انھوں نے اپنی فکری کشمکش اور انا گزیدگی کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کی شاعری کی زیریں تہوں میں نوائے سرمدی کم و بیش ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مذکورہ بالا قصیدے کے چند اشعار دیکھیے:

میں تھکا ہوا مسافر ہوں دیارِ آگہی کا   تری مے کے چند جُرعے ہیں علاج خستہ پائی
میں حرم کی سیڑھیوں سے ترے پاس اٹھ کے آیا   کہ ترے خدا کی دنیا نہ سمجھ میں میری آئی
یہ فساد کیا ہے ساقی بہ مزاجِ آتش و گل   یہ تضاد کیا ہے ساقی بہ صفاتِ کبریائی
میں خدا سے منفعل ہوں میں خودی سے منفعل ہوں   نہ ہوس ہے خود گری کی نہ دماغِ جبہ سائی
نہ سرورِ دانش و دیں نہ فتورِ زہد و تمکیں   نہ شعورِ تلخ و شیریں نہ غرورِ پارسائی

جمیل مظہری کے تمام قصائد میں موضوعات و اسالیب کی سطح پر تنوع بھی ہے اور دل کشی بھی۔

ایک قصیدہ ہے 'بہ تعارف حقیقت منتظر' جس میں بعثت رسول کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں چالیس اشعار ہیں۔ آیئے اس قصیدے سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہیں شمس و قمر آج بھی خدمت میں کسی کی — یہ کیا کہ اندھیرا سا ہے خلوت میں کسی کی
کم ہو چلی سورج کے کلیجے کی تپش بھی — شاید کہ ہے خنکی سی جلالت میں کسی کی
ہر تیرگی معدوم ہے جلوت میں کسی کی — ہر سیرت معصوم ہے سیرت میں کسی کی
رفتار کا اب ان کی اثر کیا ہو زمیں پر — تاروں کا سفر بھی ہے ہدایت میں کسی کی
گرمی شررستاں کی اماں مانگ رہی ہے — اب دھوپ بھی ہے چادر رحمت میں کسی کی
ہے میرے تحیر میں جمیل آج تیقن — دیکھی ہے جھلک پردۂ غیبت میں کسی کی

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ جمیل مظہری تشکیک کے شکار تھے لیکن الحاد سے دور تھے۔ ورنہ مراثی اور پھر نعتیہ قصائد سے اس قدر شغف انھیں کیوں ہوتا؟ محسن کاکوری کی زمین میں جوان کا نعتیہ قصیدہ ہے۔ اس کی گیرائی اور اس میں پنہاں شدتِ جذبات سے آخر کیا اندازہ ہوتا ہے؟ محسن کاکوروی کی زمین والے نعتیہ قصیدے کا معیار صف اول کے قصائد سے کسی طور پر بھی کم نہیں۔ گرچہ اس قصیدے کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن آخر میں اسی قصیدے سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

وہ محمدؐ کہ جو تھا ناسخِ اوہامِ قدیم — وہ محمدؐ کہ جو تھا مصلحِ ادیان و ملل
جس کی تعلیم سے ذہنوں کی کجی دور ہوئی — رستے سیدھے ہوئے، سیدھی ہوئی چشمِ احول
کون سورج کی طرح غارِ حرا سے نکلا — اپنے ہاتھوں میں لیے نورِ ہدیٰ کی مشعل

آگے چل کر حضرت محمدؐ اور سری کرشن کو ایک ساتھ لاتے ہیں:

کہ یہ پیغامِ سری کرشن و محمد ہیں ایک — وہی فیضانِ الوہی وہی وجدانِ عمل
دورِ ظلمات میں دونوں نے دیا حکم جہاد — یعنی جب حد سے بڑھے ظلم تو جائز ہے جدل
دونوں ہی کی یہی تعلیم کہ دنیا میں رہو — مگر اس طرح کہ جیسے رہے پانی میں کنول

مثنوی نگاری

آب وسراب: اردو مثنوی کی تاریخ بہت ہی مستحکم رہی ہے۔ ارض دکن سے لے کر شمالی ہند تک اس صنف کی روایت طویل ہے۔ دکن کی مثنویاں ہوں یا شمالی ہند کی، بیشتر مثنویوں میں داستان حسن وعشق

منظوم کی گئی ہے۔ کچھ مثنویوں کے مضامین تصوف کے حوالے سے بھی سامنے آئے ہیں۔ شمالی ہند میں مثنوی گلزارِ نسیم، زہرِ عشق اور مثنوی سحر البیان کی شہرت سے کون واقف نہیں۔ میر تقی میر کی مثنویوں کی بھی اپنی ایک معنویت رہی ہے۔ ان کے موضوعات بھی زیادہ تر حسن وعشق ہی رہے ہیں۔

اردو میں گہرے فکر و فلسفہ کو پیش کرنے والے مراثی کم لکھے گئے۔ البتہ علامہ اقبال نے اپنے خاص فلسفۂ حیات اور خودی کے نکات کی ترسیل کے لیے مثنویاں لکھیں۔ 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' میں انھوں نے ایک مربوط فکری نظام پیش کیا۔ فارسی کے علاوہ اردو میں 'ساقی نامہ' کو کافی شہرت ملی۔ اس سے پہلے شبلی کی مثنوی 'صبح امید' بھی اہمیت رکھتی ہے جس کا رنگ اصلاحی ہے۔ شاد عظیم آبادی نے مثنوی 'مادر ہند' لکھی جس کا رنگ سیاسی تھا۔ حفیظ جالندھری نے 'شاہنامہ اسلام' جیسی مذہبی اور تاریخی مثنوی لکھی جس کو کافی شہرت ملی۔ ترقی پسند عہد میں کیفی اعظمی کی 'خانہ جنگی' (1946) سردار جعفری کی مثنوی جمہور (1946) کو شہرت ملی۔

یہ ایک سرسری سا خاکہ تھا جس سے ایک تناظر خلق ہوتا ہے۔ یہاں جمیل مظہری کی مثنوی نگاری کا جائزہ لیا جائے گا۔ جمیل مظہری نے اپنی مثنوی 'آب وسراب' میں پوری زندگی اور تخلیقی تجربے کے نچوڑ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا میں انسان کے آنے کا مقصد اور اس مقصد سے منحرف ہونے کے اسباب وعلل، مذاہب اور انسان کے درمیان پُرفریب اور پُرتصنع رشتے، خدا اور انسان کے درمیان تعلق اور انسانی خواہشات اور اس کے امکانی تصورات کو اس مثنوی میں پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو رحمانی صفت عطا کی۔ یعنی انسان کے وجود سے اللہ کے اوصاف جلوہ گر ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آدم کا پتلا بنا کر اللہ نے سجدے کا حکم دیا تھا:

پانی میں بھگو کے آگ کی روح — مٹی میں سمو کے آگ کی روح
اک پیکر معتدل بنایا — تم چونک اٹھے جو دل بنایا
چونکا کے الوہیت عطا کی — رحمانی کی ہر صفت عطا کی

پہلے منظر میں شاعر حیران اور ششدر ہے کہ چہار سو فضا پر، اشجار پر طیور اور نجوم پر حیرانی کا عالم ہے۔ کہیں پانی نہیں ہے، ایک صحرائے وجود ہے، جو بے آب وگیاہ اور بے چشمہ وچاہ ہے:

بے آب و گیاہ ہے یہ صحرا — بے چشمہ و چاہ ہے یہ صحرا

دریا ہے توریت میں چھپا ہے   چشمہ تو تھک کے سوگیا ہے
لؤ چلتی ہے کارواں ہیں پیاسے   بچے پیاسے جواں ہیں پیاسے

اس طرح 'آب وسراب' کی کہانی شروع ہوتی ہے۔اس دنیا کو شاعر نے کارگہ زیاں پرستی اور ریگ وسراب کی بستی سے تعبیر کیا ہے۔نفرت اور محبت دونوں میں تشنگی کے عناصر ہیں۔ جذبۂ ناصبور اور دانش وشعور کو بھی پیاسا قرار دیا ہے۔ دوستی اور دشمنی دونوں پیاسی ہے۔جمیل مظہری نے محسوس کیا ہے کہ انسانی جبلت ہمیشہ پیاسی ہوتی ہے۔انھیں ہر سو تشنگی کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔جمیل کی حساس طبیعت پر تشنگی کا نقش کچھ یوں ابھرتا ہے:

ہر موجِ حیات کی زبانی   اِک تشنہ لبی کی سو کہانی
تاریخ ہماری اور کیا ہے   اس تشنہ لبی کا مرثیہ ہے

جمیل مظہری بھی کم وبیش دنیا کو اُسی طرح سے دیکھتے ہیں جس طرح شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔ اقبال نے بھی اپنی نظم 'روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے' میں اشیاء کائنات سے آدم کو متعارف کرایا ہے۔لیکن جمیل نے یہاں استعجاب کی رنگ آمیزی سے انسان کی مجبوری کو واضح کیا ہے۔آدم جنت سے بے آبرو ہوکر نکلے یا یہ مرضی خداوندی تھی۔اشرف المخلوقات بنانے کا مطلب کچھ تو ہوگا؟ اقبال نے بھی عظمت آدم کو مستحکم کرنے یا اس کی اصل حقیقت کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ جو لوگ دنیا میں سراب کو پانی سمجھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں انھیں فطرت کی آواز پر بھی متوجہ ہونے کی ضرورت ہے:

دیوانے سراب پر جھکے تھے   ہشیار جو تھے رُکے رُکے تھے
آنکھ اُن کی جو مسکرا رہی تھی   فطرت کی صدا یہ آرہی تھی
یہ مدعیانِ عقل و دانش   یہ سادہ دلانِ عقل و دانش
اپنی تمیزِ نیک و بد پر   دانش پر، شعور پر، خرد پر

جمیل مظہری آدم کے جنت سے زمین پر آنے کے بعد کا نقشہ کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

تم سے پہلے یہ کوہ و دریا   خاموش سوال تھے سراپا
تم آئے تو برگ و بار آیا   صحرا پہ بھی اک نکھار آیا
غنچوں نے چٹک کے منھ جو کھولا   گھونگھٹ سے غرورِ حسن بولا

ہموار کیا زمیں کا سینہ   مٹی نے اُگل دیا دفینہ
ویرانے میں باغ لہلہائے   ظلمت پہ چراغ مسکرائے

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس روئے زمین کی شادابی کا انحصار انسانی وجود پر ہے، اور کیوں نہ ہو کہ اسے خلیفۃ فی الارض بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اقبال کو بھی یاد کیجیے: تو شب آفریدی چراغ آفریدم، انسان کی عظمت کا ذکر اقبال کے یہاں بھی ہے اور جمیل مظہری کے یہاں بھی۔ اس مثنوی میں آدم کے بنائے جانے، جنت میں رہنے، اور پھر دنیا میں بھیجے جانے کا ذکر ہے۔ پھر جبر واختیار کے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔

آدم کے دنیا میں آنے کے بعد فطرت سے اس کی کشاکش رہی مگر جلد ہی اپنی خواہشات اور حرص وہوا سے مغلوب ہوکر اپنی پیاس کے لیے سراب کی طرف قدم بڑھانا شروع کردیا۔ جمیل نے اس کا اظہار کیا ہے کہ دل جو الوہیت اور ربوبیت کے عناصر سے معمور تھا اس میں غلامی اور محکومی سما گئی۔ عظمت آدم کے مجروح ہونے کو وہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

جوں جوں ہوئی سخت یہ غلامی   بڑھتی گئی دل کی تشنہ کامی
لیکن جو تھا حقِ حکمرانی   کہتے ہیں جسے نگاہ بانی
وہ فرض ادا ہوا نہ تم سے   آسودہ خدا ہوا نہ تم سے

انسان نے دنیا میں آکر اپنے اختیارات کا استعمال شروع کردیا۔ اس نے تو جنت میں گناہ کیا تھا لیکن تمام تر عظمت آدم کا خیال رکھتے ہوئے اللہ نے اسے زمین پر اتارا:

انعامِ گناہ و بے گناہی   رکھا گیا سر پہ تاج شاہی

فرشتے حیرت زدہ ہیں:

یہ کیا کہ گناہ اور بغاوت   ہو وجہِ بزرگی اور فضیلت

دنیا میں جو خلفشار اور جنگ وجدال ہے وہ اس لیے ہے کہ آدمی نفسیاتی طور پر آپسی دشمنی، کینہ پروری، بغض وحسد اور باطنی تشنہ کامی کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آدمی اگر دشمن سے بھی محبت کرنے لگے، نفرت کا جواب محبت سے دینے لگے تو دشمن بھی ایک دن دوست بن جائے گا۔ وہ عشق کی ترغیب دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اسی کے سبب آدمی اپنے سابقہ منصب جہانبانی پر آسکتا ہے۔ حرص و

ہوس میں جکڑی ہوئی خودی کو آزاد کرنے کے لیے عشق کے رموز اور اس کی برکتوں سے فیض یاب ہونا ضروری ہے۔

خدا کو بھی وہی سجدہ محبوب ہے جس میں خوف کے بجائے عشق کے عناصر ہوں۔ جمیل مظہری کا نظریہ بھی یہی ہے کہ مذہبی رسوم و قیود میں جکڑی ہوئی عبادتیں خدا کی رضامندی کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں۔ مجبوری و محکومی کو اقبال نے بھی بندے کی خودی کے لیے مہلک کہا ہے۔ ساتھ ہی اقبال نے مدرسہ اور خانقاہ کے نظام پر اور ان اداروں کے پروردہ حضرات پر طنز کیا ہے:

از غلامی مردِ حق زنّار بند   از غلامی گوہرش نا ارجمند
(بندگی نامہ: زبورِ عجم)

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک   نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ
مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب   نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

جمیل مظہری کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ انسان پر مادہ غالب آگیا ہے جو تقدیر کا حکمراں تھا وہ تقدیر اور فطرت کا غلام ہوگیا، خواہشوں کا غلام ہوگیا:

غلبہ کیا تم پہ مادّے نے   گھبرا کے تمھارے حوصلے نے
نہوڑا دیا سر کو، صلح کرلی   مجبوری کی لعنت اپنے سر لی
جو دل تھا الوہیت کا ڈیرا   آکر اُسے خواہشوں نے گھیرا
جوں جوں ہوئی سخت یہ غلامی   بڑھتی گئی دل کی تشنہ کامی

ایسے بہت سے اشعار ہیں جو اسی مفہوم کو پیش کرتے ہیں۔ جمیل مظہری نے اقبال کے اسی زاویۂ فکر کی پیروی کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ سارے مدارس و مکاتب   باجملہ عوامل و تجارب
تھے دانش و معرفت کے بازار   سکھلاتے رہے ہمیں بھی بیوپار
باجملہ عقائد و مشاغل   ہیں عقل کے اور خودی کے قاتل
افیون پلا رہے ہیں ہم کو   صدیوں سے سُلا رہے ہیں ہم کو

دراصل جمیل مظہری آدم کے تنزل پر نالاں ہیں۔ ان کی نظر میں انسانی عظمت یہ ہے کہ پوری

کائنات اور اشیائے کائنات انسانوں کے لیے مسخر کردی گئی ہیں۔

جمیل کی نظر میں مردِ مومن جیسا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ صرف آدم سے مخاطب نظر آتے ہیں:

قبضہ ہے تمہارا لامکاں تک   مہتاب سے لے کے کہکشاں تک
مختار بہ خاک و آب ہو تم   تقدیر پہ فتح یاب ہو تم
محکوم تمہارے ہیں کل اضداد   مٹھی میں ہے روحِ آتش و باد

کائنات کے مسخر ہونے کی بات کی گئی ہے، اسی لیے جمیل مظہری کو انسانی وجود اور اس کے طرزِ غلامی سے کد ہے۔ ان کا صاف ماننا ہے:

لیکن جو تھا حق حکمرانی   کہتے ہیں جسے نگاہ بانی
وہ فرض ادا ہوا نہ تم سے   آسودہ خدا ہوا نہ تم سے
تم میں اس کی صفت نہ آئی   وہ شانِ ربوبیت نہ آئی
کرتا رہا عدل بادشاہی   توہینِ عدالت الٰہی

اس مثنوی میں جمیل مظہری نے وجودِ انسانی کے اصل مقصد کو پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے اندرون میں جو تشکک اور تضادات فکری ہیں ان کا عکس بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے خود کو مردِ مجہول، دین و دانش کا مقتول، نورِ مصطفےٰ کا نادار بتایا ہے۔ ان کے اندر جو شکوک تھے ان کا علاج کہیں نہیں ملا——

اُگتے ہی رہے شکوک پیہم - بڑھتی رہی دل کی بھوک پیہم

اس مثنوی میں انسانی نفسیات کے کئی اہم گوشوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نفرت و محبت، کینہ پروری اور اسی نوع کے دوسرے نفسیاتی موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں۔ انسان کسی کے ساتھ جیسا رویہ اپناتا ہے، اسے بھی اسی طرح کا جواب ملتا ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اگر تم کسی دشمن سے محبت کرنے لگو تو اس کے اندر بھی یہی صفت منتقل ہوجائے گی۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نفرت کا علاج محبت سے ممکن ہے:

الفت بھی ایک ربط ذہنی   نفرت بھی ایک ربط ذہنی
دشمن سے کرو گے گر محبت   آجائے گی اس میں بھی سعادت
نفرت کا علاج ہے محبت   بیمار کو ہے اس کی حاجت

جمیل کا یہ بھی ماننا ہے کہ اللہ کی عبادت خوف اور معذوری کے سبب نہیں ہونی چاہیے۔ اگر

انسان کواللہ نے اپنا خلیفہ بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے تو تسخیر کائنات کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ مجبور ومقہور ہوکر زندگی گزارنی چاہیے۔ اللہ سے خائف ہوکر سجدہ کرنا اور اس کی چاہت میں سجدہ کرنا، دونوں میں فرق ہے، جمیل کو سنیے:

راسخ ہے بصد ہزار خامی — سجدوں کے مزاج میں غلامی
دی تھی جسے محبت افسوس — کی خوف سے اس کی طاعت افسوس
فرعون سمجھ کے اس کو انساں — رہتا ہے ہمیشہ اس سے ترساں

جمیل تو گوشہ نشیں ہوکر بندگی کرنے کو نامناسب سمجھتے ہیں۔ خدا سے عشق کرنے اور اسے معشوق بنانے کو بھی ایک طرح کی گمرہی اور فریب تصور کرتے ہیں:

معشوق بنا رہے ہیں اس کو — پردے میں بٹھا رہے ہیں اس کو
یہ مسخ شدہ خدا پرستی — بہکی ہوئی خواہشوں کی مستی

اس کے بعد شاعر اپنی تشنگی مٹائے جانے کا منتظر ہے:

سنتا ہوں کہ مضطرب ہے قدرت — ہے عالمِ غور میں مشیت
ہنگامے ہیں سطحِ لامکاں پر — ابر آتے ہیں گِھر کے آسماں پر
اے کاش اک ایسا اَبر آتا — جو روح کی پیاس بھی بجھاتا

اگر آپ غور کریں گے تو اندازہ ہوگا کہ اس مثنوی میں پوری انسانیت کے جذبات کو جمیل نے ذاتی فکر سے ہم آمیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جو 'سراب' کا استعارہ خلق ہوا ہے، دراصل جمیل کی اپنی زندگی کی تفسیر پیش کرتا ہے۔ تمام تہذیبوں اور مذاہب کے افکار اور انسانی شعور کے لامتناہی تسلسل کو جمیل نے اپنی اس مثنوی کا حصہ بنایا ہے۔ جو حسرت ناکی اور کرب ناکی اس کے باطن میں نظر آتی ہے، وہ 'آب و سراب' کے باہمی نقیض ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ جبر واختیار اور خودی و بیخودی انسانی زندگی کے اہم اجزا ہیں۔ اسی طرح تشنگی ایک اہم استعارہ ہے جو ناکامی، مایوسی اور اضمحلال کو ظاہر کرتی ہے۔

جمیل مظہری کی مثنوی 'آب وسراب' اردو مثنوی کے باب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ ان کی فکر کی وسعت اپنے تکوینی تصور (Cosmological Concept) اور کائنات کے اندرون میں پنہاں تمام تر اسرار کی ہم آہنگی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی گونج ان کی کئی نظموں میں بھی سنائی دیتی ہے۔

مثنوی از جہنم: یہ مثنوی سب سے پہلے جمشید پور کے ایک جریدے 'ترسیل' میں 1972 میں چھپی تھی۔ اس میں اشعار کی کل تعداد 344 ہے۔

مظہر امام نے اس مثنوی کا بھرپور تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر چند یہ مثنوی فکر کی پختگی، تابِ سخن کی جرأت آموزی، اسلوب کی شگفتگی، بے ساختگی اور روانی کے باعث خصوصی توجہ کی مستحق ہے، لیکن یہ بہت کم لوگوں کی نظر سے گزری ہے۔'' [23]

یہ مثنوی علامہ اقبال کی نظم 'ساقی نامہ' کی بحر میں ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مثنوی جاذبیت اور رواں اسلوب کے لحاظ سے 'آب وسراب' پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس میں جمیل نے 'آب وسراب' سے زیادہ بے باکانہ انداز میں اپنے فکری میلان کا اظہار کیا ہے۔

خدا کا دربار لگا ہوا ہے اور بندے تعمیلِ حکم میں کھڑے ہیں جہاں جمیل کو اپنے وطن کا ایک سرمایہ دار نظر آتا ہے جسے فرشتے جکڑے ہوئے لاتے ہیں۔ جمیل خدا کی طرف بڑھ کر اس شخص کی سفارش کرتے ہیں۔ اس میں جمیل نے وکالت یہ کی ہے کہ یہ بھی دنیا میں مخدوم اور مسجود تھا۔ یہ مغرور تھا لیکن غیور بھی تھا۔ کسی نے اگر اس سے سرکشی کی تو وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے خوشامد پسند تھی جیسے کہ تجھے بھی پسند ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

سلاسل میں تھے اس کو جکڑے ہوئے — گریباں بچارے کا پکڑے ہوئے
میں شاعر تھا انسانیت کا وکیل — بڑھا جانبِ عرشِ ربِّ جلیل

پھر گویا ہوئے:

سراپا خودی و مجسم غرور — بڑا زود حس اور بڑا ہی غیور
ہے جس طرح تجھ کو عبادت پسند — خوشامد تھی اس کو نہایت پسند
تری طرح تھا یہ بھی رب الکبار — کمینوں رذیلوں کا پروردگار
انھیں پر کرم اس کا زر پاش تھا — گدا کوئی مانگے تو قلاّش تھا
تھی یہ بھی بہرحال سنّت تری — نہیں ہوتی مفلس پہ رحمت تری

لہٰذا، عدالت کے ابرو پہ شکن آگئی اور شاعر جمیل کو دوزخ کی جانب روانہ کیا۔ یہی وہ منظر اور

فکری میلان ہے جس سے اندازہ لگالیا جاتا ہے کہ جمیل مظہری خدانخواستہ الحاد کی طرف تھے۔ دراصل اس فکر میں اللہ سے ایک بندے کی کچھ شکایتیں ہیں جو کہ اس کا حق ہے، یہ روگردانی یا سرکشی نہیں بلکہ اللہ سے قرب کا اشاریہ بھی ہے۔

اب جو جمیل کو جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے تو انھیں وہاں ہم مذاق لوگ ملتے ہیں۔ یہاں دین، مذہب یا دولت، تقویٰ اور عقیدے کا جھگڑا نہیں ہے۔ دیر و مسجد کا جھگڑا بھی نہیں۔ دراصل جمیل نے یہاں اس نوع کے لوگوں پر طنز بھی کیا ہے۔ اب جہنم سے جمیل اہل دنیا سے مخاطب ہوتے ہیں:

سنو اے عقائد کے مارو سنو　　　سنو اے عبادت گزارو سنو
عبادت خطا اور تقویٰ غلط　　　طبیعت کا رسمی تقاضا غلط
قلم میرا نشتر زباں ہے چھری　　　کہ باتیں ہیں سچی، لگیں گی بری
صناعت غلط اور ثقافت غلط　　　نئے ذہن کی ہر حماقت غلط

آگے چل کر جمیل بہت ہی جذباتی ہوکر بلند آہنگ ہوجاتے ہیں:

حقیقت ردا منہ پہ ڈالے رہے　　　عبا، اپنی مذہب پہ سنبھالے رہے
چلی میرے شعلوں کی آندھی چلی　　　چلی دیونی، بال باندھی چلی
ہلاکت کے بازو کو کستی ہوئی　　　چمکتی، دہکتی، بہکتی ہوئی

ظاہر ہے کہ جہنم سے دیونی چلی تو اس کے اثرات دین و دانش، فنون وتمدن پر لازمی طور پر پڑے۔ ایک اگنی کا ناچ تھا جسے دیکھ کر پریاں 'ہری' بولنے لگیں۔ یہاں اشعار بھی دیکھیے جس سے جمیل کی وسعت فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے افکار کی جہتیں اَن گنت ہیں جسے فکری تنوع سے بھی موسوم کر سکتے ہیں:

جو نار اور ظلمت میں گاڑھی چھنی　　　تھرکنے لگے اٹھ کے ناردُمنی
شرارے جو اس کے اٹھے بوند بوند　　　تو گھبرا کے سورج نے لی آنکھ موند
سمندر کی موجیں اچھلنے لگیں　　　اچھلنے لگیں آگ اگلنے لگیں

مریخ کے منہ سے دھواں نکلنے لگا اور جنت کی حوریں چیخنے لگیں۔ جمیل نے تمام تر ذات وکائنات کے اسرار کو اپنی فکر کے حصار میں لینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ

قیل وقال کہیں نہ کہیں عظمت آدم کے تحفظ کا کام بھی کرتا ہے۔ اقبال کو پڑھتے ہوئے بھی لگتا ہے کہ خدا سے ہم کلامی کہیں کہیں شوخی اور کہیں کہیں اس سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ جمیل کے اب یہ اشعار دیکھیے:

مری آگ ہے طور سے عرش تک　　　لہک اس کی کرسی سے ہے فرش تک
لرزتے ہیں بتخانہ ہائے صفات　　　حجاباتِ راز و طلسماتِ ذات
چہ اصنامِ دانش چہ اصنامِ فن　　　میں اک بت شکن ہوں میں اک بت شکن

اور آگے جمیل کا ارادہ یہ ہے کہ اس ذات کو عرش سے فرش پر لاکر ایک بوریے پر بٹھاؤں گا۔ یہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جمیل کے دل میں انسانیت کے لیے کس درجہ درد ہے جس کے لیے وہ خالق کائنات سے بھی مکالمہ اور مجادلہ کرتے ہیں۔ اس مجادلے اور مباحثے میں اخلاص اور صداقت کا پرتو ہے:

جو سنت ہے تیری جزا و سزا　　　تو چکھ اس جہنم کا تو بھی مزا
جو لپٹے گی تجھ سے یہ دنیا کی آنچ　　　تو محسوس ہوگی تمنا کی آنچ
جہاں سانپ ہوں نت نئے بھیس میں　　　ذرا تو بھی رہ آکے اس دیس میں
غرض اے خداوند دارالعذاب　　　ہے لعنت کدہ یہ جہانِ خراب

اس دنیا میں جو منفی نقوش اور ظلم واستحصال، افلاس اور بے چارگی، غلاظت اور جو بھی مکروہ صورتیں ہوسکتی ہیں، جمیل نے اُن کا ذکر بہت ہی شرح وبسط اور جذباتی انداز میں کیا ہے۔ یہاں یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ جمیل ایک دردآشنا دل رکھتے ہیں، اس لیے دنیا اور یہاں کے انسانوں کی خستگی دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ وہ خیر وشر کی باتیں کرتے ہیں۔ دنیا میں جو خدا بنے بیٹھے ہیں دراصل جمیل ان کے خلاف فکری احتجاج کرتے ہیں۔ شیاطین کی چالوں پر وہ نکتہ چیں ہیں:

شریعت، طریقت، تفلسف، کلام　　　انھیں کے بچھائے ہوئے ہیں یہ دام
خرافاتِ دینی کا جو ڈھیر ہے　　　انھیں کا مچایا یہ اندھیر ہے
مذاہب میں باہم جو ہے اک عناد　　　انھیں کا یہ بویا ہے تخمِ فساد

خدا انسانوں کی طرح خوشامد پسند اور سجدوں کا دریوزہ گر نہیں ہوتا۔ شاعر نوع بشر میں بغاوت کی روح پھونک دینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد وہ چاہتا ہے کہ انسان جو ابلیس کے ہاتھوں کا کھلونا ہے، وہ دنیا کی تزئین کاری میں منہمک ہوجائے۔ جمیل نے جو نقشہ پیش کیا ہے وہ حصہ لائق تحسین اور شعری جمال سے

بھرپور ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

ہو آزاد انساں کا عزم و عمل   بنے نائبِ ذاتِ حق بے خلل
اجالے کی قسمت پلٹنے لگے   کلیجہ اندھیرے کا پھٹنے لگے
ہو طاقت کے دل میں ضعیفی کا درد   جہنم کے شعلے بھریں آہ سرد
بدل جائے پیمانۂ خیر و شر   یہ انساں پہ قدرت کا نورِ نظر
بہشت اس کی ٹھوکر سے اُگنے لگیں   گُہر اس میں طاؤس چگنے لگیں

جمیل نے دنیا کی حالت زار اور خیر وشر کی کشمکش کے بعد کے تغیر کا نقشہ کچھ اسی طرح پیش کیا ہے۔ اپنے تمام تر فکری تضادات اور رویوں کے ساتھ اپنی تخلیقیت کو اس مثنوی میں آخر کے دو شعروں میں یوں پیش کرتے ہیں:

کہے اٹھ کے پیہم زمیں کا غبار   کہ مٹی سے پسپا ہوئے نورنار
مشیت کا لختِ جگر زندہ باد   خداوندِ نظمِ دگر زندہ باد

انسان کو مشیت کا لختِ جگر کہہ کر جمیل نے انسانی عظمت کی داد دی ہے اور 'نظمِ دگر' یعنی تبدیلیٔ دنیا کے بعد کا نظام اب اسی منزّہ و مصفّا انسان کے ہاتھ ہے۔ یہ ایک مبارک گھڑی ہے۔ جو لوگ جمیل کے متشکک ذہن کو موردالزام ٹھہراتے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ شعوری طور پر ایسے نہیں تھے۔ وہ خیر میں شر اور شر میں خیر کے متلاشی رہا کرتے تھے۔ دراصل وہ ایک بہتر معاشرے اور خوبصورت اور موزوں انسانی زندگی کے خواہاں تھے۔ ان کے برادر خورد رضا مظہری نے لکھا ہے:

''... بھیا کے افکار اور کردار دونوں میں ہم آہنگی نہیں بلکہ تضاد ہے۔
بھیا کو خود بھی اس کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے دل و دماغ میں
کبھی مفاہمت نہ ہو سکی۔'' 24؎

مذکورہ بالا دو معرکۃ الآرا مثنویوں 'آب وسراب' اور 'مثنوی از جہنم' کے علاوہ جمیل نے اور بھی کئی مختصر مثنویاں مختلف عنوانات کے تحت لکھی ہیں۔ ایک مثنوی ہے تنبیہ الاحباب جو جمیل مظہری کے دوست حضرت غلام رسول (کلکتہ) کی شان میں کہی گئی تھی۔ میر محمود طرزی صاحب کے مکان پر منعقد ایک محفل میں جمیل صاحب نے یہ مثنوی حضرت وحشت کلکتوی اور حضرت ناطق لکھنوی کی موجودگی میں پڑھی گئی

تھی۔ واضح ہو کہ یہ مثنوی طنزیہ و مزاحیہ ہے۔ چند اشعار:

سنیے یا حضرت غلام رسول   آدمی آپ بن گئے ہیں فضول
منہ بنائے جو گھر کو جاؤ تم   درِ توبہ کو بند پاؤ تم
چوں کہ تم اپنے فن میں کامل ہو   چور کی طرح گھر میں داخل ہو
عاجزانہ جگاؤ دائی کو   چھوؤ جیسے ہی چارپائی کو
وہ یہ سمجھے تمھارے اس ڈھب سے   کہ تم آئے ہو اور مطلب سے
پھر تو گھبرا کے غل مچا دے وہ   فتنۂ خفتہ کو جگا دے وہ
تیز دھڑکن ہو قلب عالم کی   یعنی کھل جائے آنکھ بیگم کی
آتش غیظ و شعلۂ رخسار   وقِنا ربّنا عذاب النا

'مثنوی فلفل سرخ' میں کسی مدیر کی ہجو کی گئی ہے جو مس کجّن کے شیدائیوں میں ہیں۔ اس مثنوی میں کہیں کہیں سطحی انداز بھی اپنایا گیا ہے جو کہ غالباً شدت جذبات کے تحت ہوا ہے:

جناب صابری چشتی نظامی   مدیرے از مدیرانِ گرامی
نہ کیوں ستھرا ہو ذوق شعرگوئی   زباں پیشاب کجّن سے ہے دھوئی
یہ رنڈی گر بھی رنڈی باز بھی ہیں   عصا برادر بزم راز بھی ہیں
اٹھنیا گھاٹ کے ہیں یہ کھوَیّا   سب ان کو پیار سے کہتی ہیں بھیّا

'عکس جمیل' ہی میں ایک مثنوی وطن کے رومان پرست فنکاروں سے (ایک مطائباتی مثنوی) ملتی ہے جو 34 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں مشرقی اور مغربی تخلیق کاروں کے فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ چند اشعار اس مثنوی سے پیش کیے جاتے ہیں:

السّلام اے سخن ورانِ وطن   مہر و مہتاب و اخترانِ وطن
خوشنوا گرچہ باسند ہو تم   پھر بھی بلبل نہیں چُغد ہو تم
خوابِ موہوم کے محل سازو   چرخِ تخیّل کے ہوا بازو

اب دو مزاجوں کا فرق بتاتے ہیں:

تم ہو ریتی پہ وہ ہیں دھاروں میں   تم سنیما میں وہ ستاروں میں

وہ خلاؤں کے پار جائیں گے
آگ مریخ کی بجھائیں گے
اپنے خوابوں کے دام سے نکلو
زلفِ مشکیں کی شام سے نکلو
تم ابھی تک ہو طائرانِ شجر
نوچتے ہیں وہ جبرئیل کے پر

27 اشعار پر مشتمل ایک مثنوی ’ایک ناتمام مثنوی‘ کے نام سے ہے۔ یہ مثنوی مکمل ہوتی تو شاید جمیل کے خاص متضاد فکری دھارے کو اور بھی واضح کرتی۔ اس پر تجزیاتی گفتگو یہاں ممکن نہیں، بس یہ اشعار دیکھیے:

اے مشیت کے ترجماں انساں
حجّتِ حق خلیفۃُ الرّحماں
اس کی قدرت کا شاہکار ہے تو
مجلس آرائے روزگار ہے تو
تیرے فیضِ قدم سے ہوکے ذلیل
ہیں جماد و نبات دونوں علیل
کیوں ہے نامعتدل حیات کی نبض
مضمحل کیوں ہے کائنات کی نبض
جانشینی خدا کی کھیل نہیں
مفلسوں کے دیے میں تیل نہیں

رباعی گوئی

رباعی گوئی ایک مشکل فن ہے، لیکن جمیل مظہری نے اس فن میں بھی اپنی پختہ تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ سب سے پہلے ایک نعتیہ رباعی ملاحظہ کیجیے:

خورشیدِ ظہور عالم آرا چمکا
انسان کی قسمت کا ستارا چمکا
اب ماہ فلک خلا کے غاروں میں چھپے
کہتی ہے زمیں چاند ہمارا چمکا
(وجدانِ جمیل)

ادیان کے خاکے کو بدلنے والے
تہذیب کے سانچے کو بدلنے والے
دریا کا چڑھاؤ تجھ کو کرتا ہے سلام
تاریخ کے دھارے کو بدلنے والے
(ایضاً)

بہت سی رباعیوں میں واقعات کربلا اور کربلا کے متعلقات کو پیش کیا گیا ہے۔ جمیل کی رباعیوں کے موضوعات میں مکالمے پر مبنی رباعیات بھی ہیں۔ کربلا اور اس کے کردار کے حوالے سے کئی رباعیاں ملتی ہیں۔ یہاں دو رباعیاں پیش کی جاتی ہیں:

انگشت اشارۂ ہدایت ہے حسینؑ
معیار تمیز نور و ظلمت ہے حسینؑ
تاریخ کی رہبری اندھیرے میں کی
تاریخ کی اک بڑی ضرورت ہے حسینؑ
(وجدانِ جمیل)

اے خالق ارض زندگی پیدا کر
ذرّات میں روح سرمدی پیدا کر
مٹی کو پلا چکا ہے خون شبیر
اب تو مٹی سے آدمی پیدا کر

اردو رباعی گوئی میں جمیل مظہری کا ذکر نہیں ہوتا، کیوں کہ ان کی رباعیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ نقادوں کو یہ ساری ہی رباعیاں اگر یکجا مل سکیں تو ایک مطمحِ نظر ابھر کر سامنے آسکتا ہے۔ ان کی رباعی گوئی کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر عراق رضا زیدی لکھتے ہیں:

’’ان رباعیات میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں جو ایک صف اوّل کے رباعی گو کی رباعیوں میں ہونا چاہیے۔‘‘25؎

جمیل کے فکری میلان کو ان کی رباعیات بعنوان اعتراف محرومی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کے ذیل میں 6 رباعیاں ہیں۔ ان رباعیوں میں جمیل نے اپنی زندگی اور انسانی وجود کے مابین رشتے کو بھی نشان زد کیا ہے۔ یہاں گنجائش نہیں پھر بھی دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

جلوہ تھا مگر نقاب سمجھا کیے ہم
اور آب کو عکس سمجھا کیے ہم
پندارِ خرد نے ہم کو پیاسا رکھا
پانی تھا مگر سراب سمجھا کیے ہم

ہے دشت تو دشت، کب چمن کے رہے ہم
مسجد کے ہوئے، نہ انجمن کے رہے ہم
دونوں ہوئے رفتہ رفتہ ہم سے مایوس
یزداں کے رہے نہ اہرمن کے رہے ہم

صوفی اور شاعر، شاعر اور خدا کے درمیان رباعیات کی ہیئت میں مکالمے ہیں۔ صوفی اور شاعری کے درمیان ہونے والے مکالمے پر مبنی آٹھ رباعیوں سے دو رباعیاں اس طرح ہیں:

صوفی:

سہمی ہوئی ماندگی کے ڈیرے تو نہ توڑ
شیخ اور برہمن کے ٹھکانے تو نہ توڑ
رہنے دے ابھی دیر و حرم میں ان کو
بچے ہیں یہ، بچوں کے گھروندے تو نہ توڑ

شاعر:

مانا کہ ہیں معصوموں کے جذبے سچے   پختہ نہ کبھی ہوں گے تصور کچے
گر ان کو گھروں سے نکالا نہ گیا   بچے یہ ہمیشہ ہی رہیں گے بچے

جمیل مظہری نے جو رباعیاں کہی ہیں ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوگی۔ سو سے زائد تو صرف فکر جمیل میں ہیں۔اس کے علاوہ آثار جمیل اور عکس جمیل میں بھی ہیں۔ وجدان جمیل میں بھی چند نعتیہ رباعیات ہیں۔

ان کی رباعی نگاری کے حوالے سے بھی الگ سے نوٹ تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔فکر وفن اور ڈکشن کے لحاظ سے جمیل نے اپنی رباعیوں میں ایک معیار قائم رکھا ہے۔عشق ومعرفت، جبر وقدر، شبابیات ورومانیات، سیاسیات وسماجیات، اخلاقیات وخمریات کے مضامین ان کی رباعیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔وہ اکثر خدا کے سامنے انسان کی مجبوری اور بے بسی کو پیش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ سراپا جستجو یا پیکر سوال نظر آتے ہیں۔

حواشی

1. فکر وفن، 1956، خلیل الرحمٰن اعظمی ،ص198، آزاد کتاب گھر، دہلی
2. جمیل مظہری ایک مطالعہ، ارشد کاکوی، بحوالہ تنقید وتشخیص، 1970
3. نئے پرانے چراغ، ص30
4. سہیل، گیا جمیل مظہری نمبر 1982، ص87
5. جمیل مظہری، مونوگراف، ساہتیہ اکادمی، 1992، ص52
6. فکر وفن از خلیل الرحمٰن اعظمی، 1956، ص181، آزاد کتاب گھر، دہلی6
7. فکر وفن، خلیل الرحمٰن اعظمی، 1986، ص183، آزاد کتاب گھر، اردو بازار، دہلی6
8. سہیل، گیا، جمیل مظہری نمبر، جون جولائی 1960
9. عکس جمیل: ص304
10. میرا نظریہ شعر اور میری شاعری، جمیل مظہری کی مثنوی آب وسراب، 1989، ص74، ترتیب و تدوین: ڈاکٹر ہلال نقوی، حلقہ فکر ونظر، کراچی 38

11. سراج ومنہاج، 1964، ص190
12. آثار جمیل، 1988، بہار اردو اکادمی، ص8
13. سراج ومنہاج 1964، ایوان اردو پٹنہ 4، ص217
14. جمیل مظہری، مونوگراف، ساہتیہ اکادمی 1992، ص74
15. جمیل مظہری کے مرثیے: ترتیب وتدوین: ڈاکٹر ہلال نقوی، حلقۂ فکر ونظر، 1921، فیڈرل بی ایریا، کراچی، پاکستان 1988، ص10
16. ماخوذ روح انیس، ص20
17. کائنات، جمیل مظہری نمبر، ہدایت گڑھ 1982، ص355
18. آجکل جمیل مظہری نمبر، اگست 1982، ص71
19. بحوالہ: مظہر جمیل، مرتب کوثر مظہری، 2014، ص251
20. کائنات، ہدایت گڑھ مرزاپور، اپریل- جون 1982، ص374
21. کائنات، ہدایت گڑھ مرزاپور، اپریل- جون 1982، ص382
22. عام طور پر گوپل کے بجائے 'کونپل' املا رائج ہے—(ک۔م)
23. جمیل مظہری، مونوگراف، ساہتیہ اکادمی، ص67
24. آجکل، جمیل مظہری نمبر، اگست 1921 ص9
25. بحوالہ: مظہر جمیل مرتب: کوثر مظہری، 2014، ص291

باب سوم

جمیل مظہری کے نثری کارنامے

جمیل مظہری کے نثری کارنامے

جمیل مظہری ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ ان کے تخلیقی اور فنی وفکری ارتفاع کے سب قائل ہیں، لیکن صرف شعری تناظر کے حوالے سے۔ حالانکہ جمیل مظہری نے نثری نگارشات بھی چھوڑی ہیں جو کلیات جلد چہارم کی شکل میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دلی سے 2012 میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کلیات 820 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے بہار اردو اکادمی نے دو جلدوں پر مشتمل ان کی نثری نگارشات کو شائع کیا تھا جسے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے مرتب کیا تھا۔ اس ضخیم نثری کلیات میں افسانے کے ذیل میں چھ (6)، فکاہات کے ذیل میں پندرہ اور انشائے لطیف کے ذیل میں تین تحریریں ہیں۔ یہ پہلے حصے کے مشتملات ہیں جبکہ دوسرے حصے کے مشتملات میں تنقیدی مضامین اور کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ متفرقات کے ذیل میں بھی کچھ تحریریں ہیں۔ اسی حصے میں تین اہم مضامین ہیں جو 'کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان سے ہے۔ یہ مضامین ہیں: میرا نظریہ شعر اور میری شاعری، غبار کارواں، شعر و شاعر۔

تنقید

پہلے تنقید کے حوالے سے یہ دیکھیے کہ اردو تنقید میں جمیل مظہری کی اس نوع کی تحریروں کی کیا معنویت ہے۔ اس زمرے میں بارہ (12) مضامین ہیں۔ غالب—ایک مصلح فنکار، انیسویں صدی کا ایک اجنبی ذہن، یہ دونوں غالب کا احاطہ کرتے ہیں جبکہ مضمون غالب کے نقش قدم پر، میں غالب کا تتبع کرنے والے شعرا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دو مضامین انیس پر، ایک اقبال پر (دو اقبال)، شاد پر، انشاء اللہ خاں انشا پر، مبارک عظیم آبادی پر اور ایک دل چسپ مضمون فسانۂ آزاد کے مشہور زمانہ کردار 'میاں خوجی' پر ہے۔ اس حصے کا پہلا مضمون اردو لٹریری کانفرنس کلکتہ (1935) کا خطبۂ استقبالیہ ہے جو کسی قدر طویل ہے۔

پہلے ہم ان کے مضمون 'دو اقبال' سے بحث کرتے ہیں۔ اس کا جواز یہ ہے کہ جمیل کی شخصیت

میں بھی دو جمیل تھے، اسی لیے انھوں نے بھی اقبال کی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جمیل مظہری نے 'اپنا تعارف' (20 اشعار) کے عنوان سے ایک نظم بھی کہی ہے۔ چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

دو جمیل اک جمیل کے اندر   یہ تضادات اور دوئی کیوں ہے
یعنی جب ہے وہ منکرِ ادیان   ذہن پھر اس کا مذہبی کیوں ہے
وہ مسلمان تو نہیں بے شک   پھر حسینی و حیدری کیوں ہے
زہد کو بھی غلط سمجھتا ہے   بزم رنداں سے بے رخی کیوں ہے
اس کے ایثار میں بھی ہے پندار   یہ خودی ہے تو بیخودی کیوں ہے
جب طبیعت میں انفعال سا ہے   دین و دنیا سے برہمی کیوں ہے
مظہری خود بھی سوچتا ہے یہی   مظہری کیا ہے مظہری کیوں ہے

(اپنا تعارف: عکس جمیل)

جمیل مظہری نے اپنے بارہ صفحے کے مضمون 'دو اقبال' میں اقبال کی ذہنی ساخت کے دو لخت ہونے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے کلام کی دو رنگی بلکہ سہ رنگی حقیقت بیں نگاہوں کو کسی نتیجے پر پہنچنے نہیں دیتی۔ اقبال نے نٹشے کے لیے کہا تھا: قلبِ او مومن دماغش کافر است۔ لوگوں نے اس مصرعے کو اقبال ہی پر چسپاں کرنا شروع کر دیا، لیکن جمیل مظہری کا ماننا ہے کہ سچ پوچھیے تو اقبال کے ذہن کا پہلا معمار غالب تھا، نہ کہ نٹشے اور رومی۔ اقبال کے اندر جو مرد غازی اور مردِ درویش یا قومی جذبے سے سرشار شاعری کا سورج طلوع ہوتا ہے اس سے جمیل یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان کے اندر جذبات کی رزم گاہ ہے۔ ان کی نظر اس مصرعوں پر بھی جاتی ہے کہ اقبال کہتے ہیں 'ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا' اور کچھ دنوں بعد 'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' کہتے ہیں۔ اقبال کے پورے تخلیقی وجدان کا مرکزی حوالہ خودی ہے۔ جمیل اقبال کا ایک شعر لکھ کر جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ دل چسپ بھی ہے اور بحث طلب بھی۔

''بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو   یہ میری خود نگہداری کہیں ساحل نہ بن جائے

بلاشبہ خودی انسان کو خود اس کی ذات میں محدود کر دیتی ہے اور عشق دوسرے یا دوسروں کی ذات میں اپنے کو گم کر دینے کا سبق پڑھاتا

ہے۔ ان دونوں جذبوں میں سے ایک کا نام فلسفہ نے 'اقرارِ ذات' اور دوسرے کا 'انکارِ ذات' رکھا ہے۔ اقبال ان دو مختلف المزاج جذبوں میں کوئی مفاہمت پیدا نہ کر سکے اور ہمارے لیے الفاظ و معانی کا ایک ایسا طلسم خانہ کھڑا کر گئے جس سے ہم اپنا سر تو پٹکتے ہیں اور یہ سمجھ نہیں پاتے کہ اقبال ہمیں 'اسرارِ خودی' کا درس دے رہے ہیں یا 'رموز بے خودی' کا سبق پڑھا رہے ہیں۔''[1]

جمیل مظہری اقبال کو کلیم الدین احمد ہی کی طرح ایک پیغامبر شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اقبال نے فلسفہ تو بہت پڑھا تھا لیکن اس سے ان کے ذہن کا جذباتی سانچہ نہیں بدل سکا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ... فلسفہ انھیں یہ نہ سکھا سکا کہ آگ اگر کہیں ہو تو اس پر کب راکھ ڈالنی چاہیے اور کب تیل چھڑکنا چاہیے۔ اگر جمیل کی اس رائے سے آپ اتفاق نہیں رکھتے تو کوئی حرج نہیں، لیکن انھوں نے ایک اور سامنے کی بات کی ہے جو سننے میں پہلے تاثر میں تو اچھا اور چونکانے والا لگتا ہے، لیکن غور کرنے پر اس کا تاثر زائل ہو جاتا ہے:

''... لیکن اسے ہماری اجتماعی زندگی کا سانحہ نہ کہیے تو کیا کہیے کہ مولانا (مولانا آزاد) کے ذہن کا سانچہ مولوی ہونے کے باوجود فلسفیانہ تھا اور ہمارے اس شاعر اعظم کا ذہن بیرسٹر ہونے کے باوجود مولویانہ ہی رہا۔''[2]

یہاں مجھے کہنے دیجیے کہ جمیل مظہری نے اقبال کی ذہنی ساخت کی قرأت ذرا غلط انداز میں کی ہے۔ دونوں کے ذہنوں میں بعد المشرقین ہے۔ مولانا آزاد ذہین و فطین، صاحب اسلوب ادیب، اور سب سے بڑھ کر حکمت و دانائی سے بھرپور ایک عظیم سیاست داں تھے۔ لیکن، اقبال نے فلسفے کا باضابطہ مطالعہ کیا تھا۔ عربی، فارسی اور مغربی فلسفوں کو کھنگالا تھا۔ پھر یہ کہ قرآنی علوم پر بھی ان کی نظر تھی۔ اس سے بھی دو قدم آگے انھوں نے دنیا کے بڑے بڑے تخلیق کاروں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ مولانا رومی ان کے معنوی استاد اور پیر تھے۔ لہٰذا، کئی لحاظ سے اقبال کی دانشوری اور آگہی مولانا کی فکر و دانش پر فائق نظر آتی ہے۔ مولانا نے اتنا اور اس شدت سے مسلم قوم اور اس کے نوجوانوں کو نہیں للکارا ہوگا جس شدت سے اقبال نے للکارا ہے۔ اقبال کی شاعری میں ولولہ، جوش اور تلاطم خیز موجوں کو دیکھتے ہوئے یہ قطعی نہیں کہا جاسکتا

کہ اقبال کا ذہن مولویانہ تھا۔

ایک مغالطہ اور ہوا ہے۔ جمیل صاحب نے نظم 'نیا شوالہ' کو اپنے سامنے رکھ کر کہا کہ اس میں جذباتی پن ہے لیکن اسلامی جذبے کی ایک دوسری لہر آئی تو ایک دوسری نظم لکھ کر اس قومی شوالے اور اسی قومی عبادت گاہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ اشعار پیش کیے ہیں:

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھادے　　اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

دونوں نظموں کے زمانی بُعد کو بھی پیش رکھنا ضروری ہے تا کہ شاعر کے ذہنی وفکری ارتقا کو سمجھا جاسکے۔ ان کی نظر میں یہ بھی ہے کہ ''اقبال شاعر ملت نہیں شاعر آفاق تھا'' (ایضاً ص 423) اگر اقبال کی شاعری میں آفاقیت ہے تو پھر قومی شوالے کی اینٹ سے اینٹ بجانے والی بات از خود کالعدم ہو جاتی ہے۔ پورے مضمون میں جمیل نے اقبال کی شدید اسلامی فکر پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے اور یہ کہا ہے کہ 'دو اقبال' ہیں، ایک میں یزدانی قوت ہے اور دوسرے میں اہرمنی۔ یہ بھی لکھا ہے: اقبال ہمیں جنگ و رزم کا ایک ایسا دیوتا نظر آتا ہے جو اپنے ایک ہاتھ سے بارود چھڑک رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے امرت۔ آگے چل کر وہ اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ کیا اندھیر ہے کہ اقبال کی چند خالص ملی نظموں کو پڑھ کر یہ غُل مچایا جائے کہ اقبال فرقہ پرست شاعر ہے اور اس کے پورے اس مجموعۂ نظم 'پیام مشرق' کو جس میں اس نے ایشیا کی طرف سے یورپ کو پیغام حیات دیا تھا، نظر انداز کر دیا جائے... اس مجموعے میں اقبال نے ارتقائے نسل آدم کا جو پیغام دیا ہے اور ارتقاع نسل آدم کی جو پیش گوئی کی ہے اس کی دوسری مثال اقبال کے معترض ہمیں یورپ کے کسی لٹریچر میں دکھلائیں۔''[3]

جمیل مظہری نے اقبال کے افکار اور شعری وفور کو بغیر کسی تنقیدی تھیوری کے خود اپنی تنقیدی نظر سے پرکھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ ضرور دیکھنا چاہیے تھا کہ اقبال کے ذہنی ارتقا کے جو واضح نقوش ان کی فکری وتخلیقی روش پر نظر آرہے ہیں، ان کے پیچھے آخر کار محرکات کیا رہے ہیں۔ جمیل صاحب جب اقبال کو

ایک آفاقی شاعر تسلیم کر لیتے ہیں تو پھر اقبال کے تئیں ان کے ماقبل تصورات خود ہی بے معنی ہو جاتے ہیں۔

جمیل مظہری بقول اعجاز علی ارشد جمالیاتی اور تاثراتی تنقید سے قربت رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''موضوع زیر بحث سے ایک نوع کی جذباتی وابستگی انھیں اکثر پوری طرح غیر جانب دار نہیں رہنے دیتی۔''[4]

یہیں پر جمیل مظہری کے ایک مضمون 'کلکتہ اک رباب' (حرمت الاکرام کا شعری مجموعہ) سے یہ اقتباس پیش کیا گیا ہے:

''میری ایک نفسیاتی مجبوری ہے کہ اگر میں کچھ ہوں تو ایک شاعر ہوں نقاد نہیں۔ نقاد اپنے مزاج سے بینا ہوتا ہے اور شاعر اپنی طبیعت کا بادشاہ۔ میرے ہاتھ میں ترازو نہیں کہ تولوں اور ڈنڈی مارا کروں۔ میرے پاس تو الفاظ تحسین کی اشرفیوں کے توڑے ہیں جنھیں میں بے دریغ لٹاتا ہوں۔''[5]

اس اقتباس میں جمیل نے اپنے نقاد ہونے کی تردید کر دی ہے، لیکن کیا ان کے مضامین ایسے نہیں کہ ان کا جائزہ لیا جاسکے؟ میرے خیال میں جمیل مظہری حد درجہ جذباتی تھے اس لیے اپنے بارے میں ایسا کہا۔ یہ تو سچ ہے کہ وہ نِرے نقاد نہیں تھے۔ ان کی تنقیدی نگارشات میں تخلیقی آہنگ واسلوب ملتا ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی تحریریں تنقیدی بصیرت سے معرّا ہیں۔

جمیل مظہری نے غالب کو ایک مصلح فنکار بتایا ہے۔ اپنی بات انھوں نے یہ کہہ کر ایک تھیسس بنانے کی کوشش کی ہے کہ صوفیوں نے نوجوانوں کو یہ کہہ کر بہکا دیا تھا کہ عشق بندگی کی ایک ارتقائی سیڑھی ہے۔ پھر رومی کی غزل کے اشعار پیش کر کے کہا ہے کہ اردو اور فارسی کے شعرا اسی قصیدۂ عشق کی تشریح کرتے رہے:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

ان کا خیال ہے کہ غالب نے اس میلان اور تصور کے خلاف اعلان کیا:

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

دراصل ہر شخص اپنے دعوے کے مطابق دلیل بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ جمیل صاحب کے سامنے یہ شعر بھی تو ہوگا:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

غالب تو یہ بھی کہتا ہے:

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

وہ لکھتے ہیں:

''غالب کے مشرب میں عشق اسی حد تک گوارہ ہے جہاں تک یہ جذبہ
عاشق کی انا کو مجروح نہ کرے۔''[6]

یہ نکتہ جمیل مظہری نے درست بیان کیا ہے اور اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب کی انانیت اور خودداری صرف عشق ہی کیا بندگی میں بھی نظر آتی ہے۔

غالب تو بادشاہ کے حکم سے فرہاد کے نہر کھودنے کو بھی عشق کی توہین سمجھتا ہے اور اسے رد کر دیتا ہے۔ جس کی طرف جمیل صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

معشوق کی ناز برداری کی انتہا ہوتی ہے۔ عشق میں معذوری کیوں؟

عشق ومزدورئ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیمِ نکو نامئ فرہاد نہیں

ایسی نیک نامی نہیں چاہیے جس میں عاشق کی انا مجروح ہو۔ یا بقول جمیل غالب میاں فرہاد سے اس بنا پر بھی خوش نہیں ہیں کہ ''وہ سرگشتۂ رسوم و قیود'' تھا اور خودکشی کا کوئی جدید طریقہ ایجاد نہ کر کے جان دینے کے لیے پرانے وسائل اختیار کر رہا تھا۔''[7]

یہ بات ہم سب تسلیم کرتے ہیں کہ غالب کا ذہن اجتہاد پسند تھا۔ بقول جمیل: مذہب کے غلط تصور نے غالب کے معاشرے کو جس شدت کے ساتھ تقلید پسند بنا رکھا تھا، غالب جیسے مصلح کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی تھی جو اس نے اس سلیقے سے کی۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

جمیل مظہری نے بہت سے زعمائے قوم اور اکابر ادباو شعرا کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ان کی ذہنی تربیت میں بھی غالب کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ انھوں نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ حالات سے سمجھوتہ کرنا سرسید نے غالب ہی سے سیکھا۔''[8]

غالب ہی پر ایک دوسرا مضمون 'انیسویں صدی کا ایک اجنبی ذہن' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون کا نچوڑ اور لب لباب غالب کا یہ شعر ہے:

ہوں گرمئ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

جمیل مظہری غالب کے فکری وفور کا جائزہ لینے کے بعد کہتے ہیں:

''ہم تو بس زیادہ سے زیادہ یہی بتلا سکتے ہیں کہ وہ ایک اجنبی روح اور
ایک اجنبی ذہن تھا جو نہ معلوم کس سیارے سے بھٹک کر اس کرۂ ارض
پر آ گیا تھا۔''[9]

ان دو مضامین کے علاوہ ایک مضمون 'غالب کے نقشِ قدم پر' کے عنوان سے ہے۔ جس میں جمیل نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ غالب سے کون کون سے شعرا متاثر ہوئے اور غالب کے رنگ میں شاعری کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایک خاص بات جمیل صاحب نے کہی ہے کہ:

''میرے مطالعے کی کم مائیگی نے غالب کے جتنے تلامذہ کے دیوان
دیکھے ہیں غالب کے خاص رنگ کی کوئی چھینٹ کہیں ان میں نظر نہیں
آئی۔ صرف ایک استثنٰی نواب یوسف علی خاں ناظم ہیں جن کی کم از کم
ایک غزل جا بہ جا سے غالب کے رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہے۔''[10]

حالی غالب کی شاگردی میں رہے تو سہی لیکن ذہنی ساخت وافتادِ غالب سے میل نہیں کھاتی۔ جمیل مظہری نے تسلیم کیا ہے کہ حالی بھی غالب کے نقش قدم کو ناظم کی طرح چومتے ہی نظر آتے ہیں۔ حضرت آسی غازی پوری اور فضل حق آزاد کے یہاں غالب کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے اساتذہ سخن صفی، عزیز، ثاقب، ناطق، چکبست اور رسوا نے بقول جمیل مظہری غالب کی تقلید کے عہد نامے پر اپنے اپنے دستخط کیے (کلیاتِ جمیل مظہری، جلد چہارم، ص436)۔ حسرت موہانی کے یہاں مومن کا رنگ تغزل حاوی ہے تاہم غالب کا رنگ کہیں کہیں ضرور دکھائی دے جاتا ہے۔

جمیل مظہری نے اصغر، فانی، جگر، محمد علی جوہر، وحشت کلکتوی، اقبال، فیض، محروم، جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، قمر صدیقی، آصف بنارسی، عباس علی خاں بیخود وغیرہ کے یہاں غالب کی چمک دیکھی

جاسکتی ہے۔اسی طرح نثری اسلوب کے تتبع کا ذکر کرتے ہوئے جمیل نے سجاد حیدر یلدرم، مولانا آزاد، سلطان حیدر جوش، مہدی افادی، سجاد انصاری اور نیاز فتح پوری کے حوالے سے لکھا ہے کہ — ''ان کی تصانیف کے اوراق الٹیے، غالب کی ٹکسال کے سکے آپ کو ہر صفحے پر بکھرے نظر آئیں گے۔''11؎

ایک بات تو بالکل صاف ہے کہ جمیل کی نظر اردو کے تمام شعری ونثری تناظرات پر تھی، جن کی روشنی میں وہ زیر بحث شاعر، شعری مجموعہ، یا شعری ونثری متون کو پرکھتے تھے۔

شاد عظیم آبادی کی شاعری کا جائزہ جمیل مظہری نے ان کی استعارہ سازی کی روشنی میں لیا ہے۔انھوں نے تشبیہ اور استعارے کو بجا طور پر عروس سخن کے دو زیور سے موسوم کیا ہے۔شاد کے یہاں میخانہ، پیر مغاں اور بادہ کش کا استعمال بہت ہوا ہے اور سب بقول جمیل مظہری شاد نے رموز معرفت کو پیش کرنے کے لیے کیا ہے۔شاد کو وہ ایک صوفی مفکر مانتے ہیں لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے یہاں مذہبیت کا اتنا غلبہ نہیں تھا کہ انھیں فقیہ ومحدث اور مفسر ثابت کیا جائے۔وہ شاد کی تخلیقیت اور فکری عظمت کے قائل ہیں۔لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے اپنے عہد کی شعری فضا کو جو پازیب کی جھنکار سے گونجی ہوئی تھی، ایک الوہی نغمگی سے گوش آشنا بنایا... صنعت ایہام کے بطن سے رعایت لفظی کو حسین ڈائن پیدا ہوئی تھی، اس حسین ڈائن کا انھوں نے گلا گھونٹ کر اہل فن کو حسن معنی کا دلدادہ بنایا۔''12؎

شاد کی غزل گوئی میں جو داخلیت ہے اس سے ان کی تخلیقیت کو قوت پرواز ملی ہے اور جس طرح انھوں نے انسانی جذبات کو اپنے باطن سے ہم آہنگ کر کے متصوفانہ رنگ میں غزلوں کا مرقع پیش کیا ہے، اس سے ان کا شعری وقار مزید بڑھ جاتا ہے۔عرفان وآگہی کے رموز سے شاد کی غزلیں مزین نظر آتی ہیں۔جمیل مظہری نے کچھ ایسے اشعار پیش کیے ہیں جن میں شاد کی تخلیقی ہنرمندی اور فکری تمکنت کا رنگ واضح طور پر نظر آتا ہے۔دو اشعار دیکھیے:

وہ عالم گیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا　　خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس کس پہ شک تیرا
اس کی نگاہ ناز جو پلٹی تو دیکھنا　　منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا

شاد کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ مرثیوں میں بھی شاد نے حکیمانہ اور عارفانہ رنگ بھرا۔ساتھ ہی جمیل مظہری نے سرسری طور پر ہی سہی، شاد کے مقالوں اور ناول کی اہمیت کا بھی ذکر کیا

ہے۔شیعہ اور سنّی کے درمیان حائل خلیج کو بھی شاد کی تحریروں سے پاٹنے میں مدد ملی۔آخر میں یہ لکھا ہے کہ ''ہمیں یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ تعصب کی شعلگی جس نے فکر ونظر اور شعر وادب کی دنیاؤں کو بھی گلخن بنا رکھا تھا اس کے لیے شاد کی متصوفانہ نغمگی میگھ راگ ثابت ہوئی۔''13؎

جمیل مظہری نے اپنی تنقیدی بصیرت کی روشنی میں شاد کی استعارہ سازی اور ایک خاص زاویے کی طرف اشارہ کیا ہے جو کہ لائق توجہ ہے۔

جمیل مظہری نے اپنے نظریہ شعر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔کبیر اور تلسی داس کو یاد کرتے ہوئے فردوسی اور سعدی کے سامنے عقیدت کی پیشانی جھکائی ہے کیوں کہ ان شعرا نے سیکڑوں انسانی جذبوں سے ہمیں روشناس کرایا۔پورے مضمون میں جمیل مظہری نے سچے انسانی جذبات کی ترجمانی پر زور دیا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کا ذکر بھی کیا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''شاعر وہی ہے جو دوسروں کے دل کی دھڑکنوں کو بھی اپنے اشعار میں سمو سکے کیوں کہ شاعری اگر نام ہے داخلی جذبوں کی ترجمانی کا تو اس داخلیت کی گنجائش خارجی دنیا میں زیادہ ملے گی، قدم قدم پر ملے گی، نت نئے بھیس میں ملے گی۔''14؎

جمیل مظہری داخلیت اور خارجیت کی تقسیم کو ہی غلط قرار دیتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ کوئی شاعر اگر صرف اپنی داخلی دنیا میں بند رہتا ہے اور خارجی دنیا سے بے نیاز ہوتا ہے تو یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں۔داخلیت کے ساتھ ساتھ جمیل مظہری کی نظر قوت متخیلہ اور مبالغہ پر بھی ہے۔انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے حالی اور شبلی کے وہ مباحث بھی رہے ہوں گے جو مقدمہ شعر وشاعری اور شعر العجم (جلد چہارم) میں مذکور ہیں۔تخیل یا قوت متخیلہ کے حوالے سے حالی اور شبلی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔جمیل مظہری کے بقول:

> ''شاعر اسی قوت متخیلہ کے سہارے پردے کے اِس پار رہ کر بھی اس پار کی باتیں کرتا ہے۔''

> ''تخیلات اور مشاہدات کا توازن اسی صورت میں برقرار رہ سکتا ہے

کہ ہماری یہ قوت ہمیں عرش کی بلندیوں کے ساتھ زمین کی پستیوں اور
دلوں کی گہرائیوں میں لے جائے۔ تخیل اور تشبیہ کی بے اعتدالیاں
ہمیں رفتہ رفتہ مفروضات کا خوگر بنا دیتی ہیں۔''

''کلام میں حسن اعتدال پسندی اور موقع شناسی سے پیدا ہوتا ہے۔
شاعر کو اس کا سب سے زیادہ لحاظ عبارت کے بندوبست اور لفظوں کی
معنوی بندش میں رکھنا چاہیے۔''15؎

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ جمیل مظہری کی نظر قدیم تنقیدی تصورات پر بھی رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جانب وہ جس قدر توجہ دے سکتے تھے، نہیں دے سکے۔

تنقیدی مضامین میں اور بھی اہم نگارشات ہیں۔ انیس کے حوالے سے ان کے دو مضامین ہیں جن میں سے ایک انیس کی نامقبولیت کے اسباب کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ میرا ماننا ہے کہ انیس اردو شاعری میں کسی بھی طرح نامقبول نہیں رہے۔ انھوں نے انیس کے خاص فرقے اور عقیدے کا ذکر کیا ہے جو کہ بے معنی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ علامہ شبلی نے 'موازنۂ انیس و دبیر' لکھ کر ہمیشہ کے لیے انیس کو بساطِ شعر پر نقش کر دیا۔ ایک مضمون انیس کے مراثی میں صنفی جذبات کی عکاسی کے حوالے سے ہے جس میں جمیل نے انیس کی شاعری سے مثالیں دے کر اس زاویے کو مثبت انداز میں پیش کیا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ جمیل مظہری نے تقریظیں اور تبصرے بھی لکھے ہیں جن میں سے بیشتر میں تعریفی پہلو ہیں جیسا کہ اس نوع کی تحریروں کا تقاضا ہوتا ہے۔ حالاں کہ تبصروں میں تنقیدی انداز میں بات کہی جاسکتی ہے جس کا گزر جمیل کے یہاں کم کم ہے۔

افسانے

جمیل مظہری نے اردو فکشن کو بھی اپنی کئی اہم نگارشات سے مالا مال کیا ہے۔ بہت زیادہ تو نہیں لیکن اپنے چھ سات افسانوں ہی سے اپنی چھاپ چھوڑ دی۔ تاریخی لحاظ سے اُن کے شائع شدہ افسانوں کی ترتیب کچھ اس طرح پیش کی جاسکتی ہے:

گناہ کی بیٹیاں	فروری 1932	رسالہ فلم ریویو، کلکتہ
گناہ کے دو بیٹے	اپریل 1935	ماہ تمام، کلکتہ
گناہ کی تجارت	1935	رسالہ ندیم، گیا
فرض کی قربان گاہ پر	1935-40 (دو قسطوں میں)	رسالہ ندیم گیا
ایک سوال	اپریل 1946	رسالہ نگار، لکھنؤ
ایک خیال	مئی 1977	رسالہ عصری ادب، دہلی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذکورہ بالا محض چھ افسانوں کی بنیاد پر جمیل مظہری کو اردو فکشن میں جگہ مل سکتی ہے؟ یہ سوال مناسب اور بجا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ اس نوع کی تحریروں کو وہ مضامین کے زمرے میں بھی رکھتے تھے۔ ان کے قلم اور فکر کی جولانی اور ان کا طرزِ انشاپردازی کچھ اس نوع کا تھا کہ یہ تحریریں انشائیہ اور مضمون کی سرحدوں کو بھی چھوتی ہیں۔ اسی لیے پروفیسر محمد حسن نے اپنے رسالے عصری ادب مئی 1977 کے شمارے میں جمیل مظہری کا افسانہ 'ایک خیال' شائع کرتے ہوئے یہ نوٹ لگایا تھا:

''جمیل مظہری شاعر کی حیثیت سے معروف و مستند ہیں لیکن ان کا
افسانہ شکست و فتح جنھوں نے پڑھا ہے انھیں وہ افسانہ نگار کی حیثیت
سے بھی سدا یاد رہیں گے۔ 'ایک خیال' ان کا دوسرا افسانہ ہے اور ایسا
افسانہ ہے جو انشائیہ، مقالہ اور افسانے کی سرحد پر نظر آتا ہے۔''16؎

یہاں جن افسانوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے مضامین ہیں جنھیں افسانے اور انشائیے کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح نیاز فتح پوری نے بھی اپنے رسالے نگار (اپریل 1946) میں جمیل مظہری کا افسانہ 'ایک سوال' شائع کرتے ہوئے طویل نوٹ لگایا تھا جس میں اسے افسانہ کے بجائے مقالہ اور مضمون ہی گردانا تھا:

''... اس مضمون میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز کے ساتھ مزدک
کی تعلیمات کو پیش کیا ہے جو کچھ زمانے تک ایران کی سرزمین میں
'قدر راول' کی چیز سمجھی جاتی تھی۔''17؎

حالاں کہ خود جمیل مظہری نے اسے تاریخی بنیاد پر ایک تخئیلی افسانہ کہا ہے—اس افسانے میں

جمیل مظہری نے کائنات اور انسانی زندگی کے بہت سے مسائل کے حوالے سے سوالات قائم کیے ہیں۔ کوئی بھی شاعر یا ادیب جو فلسفیانہ ذہن رکھتا ہے، وہ کائنات اور وجودِ انسانی پر سوالات ضرور قائم کرتا ہے۔ جمیل کی شاعری میں بھی یہی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ افسانہ ایک سوال سے ایک اقتباس دیکھیے:

> ''اے رونے والو! میرے قریب آؤ۔ میں آنسوؤں کے اس جزیرے میں ہنسی کے پھول کھلانے آیا ہوں، لیکن جس کھیت میں آنسو بوئے جا رہے ہیں اس میں ہنسی کیسے اُگ سکتی ہے—اے رونے والو! اپنا رونا بند کرو مقدس آگ تمھارے آنسوؤں سے ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ میں اسے روشن رکھنا چاہتا ہوں لیکن جہاں چولھے سرد ہوں وہاں آتش کدے کیسے روشن رہ سکتے ہیں۔''18؎

اقتباس کا آخری جملہ— لیکن جہاں چولھے سرد ہوں وہاں آتشکدے کیسے روشن رہ سکتے ہیں—'' ایک سوال ہے، ایک طنز ہے۔ یہ افسانہ زردشت کے دوصدی بعد پیدا ہونے والے مزدک کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس میں ان کی ساری سیاسی بدقماشیوں کو مزدک کے تاریخی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیے اور آج کی طبقاتی کشمکش کے تناظر میں غور کیجیے:

> ''اس لیے کہ تیری سلطنت میں دولت کا تنور محبت کی ہڈیوں سے سلگایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ تیری سلطنت میں یزداں کی نعمتیں سمٹی جا رہی ہیں۔ انھیں بکھرنا چاہیے مگر سمٹ رہی ہیں۔ سو گھروں کا حصہ ایک گھر میں سمٹ رہا ہے۔ سو ہاتھوں کی مزدوری ایک ہاتھ میں پہنچ رہی ہے... جاگیردارانہ نظام کو موت دے۔ کوٹھیوں کا منہ کھول دے...''19؎

اگر غور کیجیے تو یہ افسانہ ترقی پسندی کے منشور کے عین مطابق ہے۔ یہ محض مزدک کی تعلیمات یا تاریخی حوالے کے طور پر اسے یاد کر کے چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ جمیل مظہری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ سے ایک کردار منتخب کر کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اسلوب نگارش بھی دل چسپ اور اثر انگیز ہے۔ یہاں ان کے تمام افسانوں کا تجزیہ مشکل ہے، البتہ 'فرض کی قربان گاہ پر'

قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ طویل افسانہ بعد میں 'شکست و فتح' کے عنوان سے مشہور ہوا اور آج بہت سی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب کا حصہ ہے۔ آیئے اس طویل افسانے یا ناولٹ پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔

فرض کی قربان گاہ پر/شکست و فتح

پہلی بار یہ طویل افسانہ یا ناولٹ رسالہ 'ندیم' میں دو قسطوں میں 'فرض کی قربان گاہ پر' کے عنوان سے 1935 اور 1940 میں شائع ہوا تھا۔ جمیل مظہری کے چھوٹے بھائی رضا مظہری نے اسے 'شکست و فتح' کے نام سے 1950 میں شائع کیا۔

جمیل مظہری کی رومانی شاعری اور اُن کی نثری تخلیق 'شکست و فتح' میں ایک ربط زمانی موجود ہے۔ بلکہ بغور مطالعہ سے ان میں پیش کردہ تجربات واحساسات میں بھی کافی حد تک یکسانیت اور مماثلت کا پتہ چلتا ہے۔ حقیقتاً اس پردہ زنگاری میں کوئی زندہ شعلہ فشاں وجود انگڑائی لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ان کے چند افسانے روایات پر مبنی ہیں لیکن 'شکست و فتح'' میں ان کے اندر کا فن کار ایک نئی سمت اور نئی دنیا کی طرف رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ اس تخلیق میں وہ روایتی طرز تحریر سے علاحدہ اسلوب نگارش رکھتے ہیں اور اس ناولٹ کی کامیاب کردار نگاری سے ان کے اندر کا چھپا ہوا اصل انسان سامنے آ گیا ہے اور ان کی شخصیت ایک صاف و شفاف شیشہ کی طرح نکھر آئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے کچھ اہم اور نادر تجربات ایسے تھے جن کی پیش کش کے لیے نثری پیکر ہی زیادہ موزوں تھا جس میں وہ اپنے مافی الضمیر کو کماحقہٗ ادا کر سکتے تھے۔ دوسری نثری تحریروں میں ان کے فکاہیہ کالم، تقریظات اور اِکا دُکا تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ فکشن کے نام پر 'شکست و فتح' ہی مشہور و معروف ہے۔

علامہ جمیل مظہری کی اس نثری تخلیق کی ساخت اور ہیئت کیا ہے، یہ سوال بھی ہمیشہ زیر بحث رہا ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی رضا مظہری 'عرض ناشر' میں لکھتے ہیں:

> ''برادر محترم حضرت جمیلؔ مظہری کا یہ افسانہ دو قسطوں میں رسالہ ندیم کے خاص نمبروں میں ''فرض کی قربان گاہ پر'' کے عنوان سے شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکا ہے۔''

کیا افسانوی پیکر کے حدود و شرائط کو اس میں برتنے کی کوشش کی گئی ہے؟ افسانہ میں واقعات کی

ترتیب و پیش کش، اختصار اور ہنرمندی کے ساتھ ہوتی ہے اور یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ افسانہ میں زندگی کے ایک پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ افسانہ میں وحدت تاثر کا خاص عمل دخل ہوتا ہے مگر 'شکست و فتح' میں ان باتوں کا کم ہی خیال رکھا گیا ہے اور اسی لیے نقادوں نے اس نثری تخلیق کو 'ناولٹ' کے زمرے میں رکھنے پر زور دیا ہے۔

ناول، ناولٹ اور طویل مختصر افسانہ کو سمجھنے کے لیے جناب وحید اختر کا یہ قول ملاحظہ کریں:

> ''ناول یا ناولٹ Miniature ہے اور طویل مختصر کہانی افسانے کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے یعنی ناولٹ کو ناول کے اصول کے مطابق ہونا چاہیے اور طویل مختصر کہانی کو افسانے کے معیاروں پر پورا اترنا چاہیے۔''

اس ضمن میں وارث علوی کا موقف ہے کہ:

> ''ناول اور ناولٹ میں کیا فرق کرتے ہیں؟... ان میں فرق کرنا دشوار ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں ایک Theme اور کم کردار کے ذریعہ سے ایک مخصوص تاثر کو ابھارا جائے تو وہ ناولٹ ہوتا ہے... یعنی مختصر افسانے کی طویل شکل سمجھ لیجیے جب کہ ناول میں زیادہ سے زیادہ Themes ہوسکتے ہیں، Sub Plot ہوسکتے ہیں، مختلف تاثرات بھی ابھر سکتے ہیں۔''

مذکورہ بالا اقوال کی روشنی میں ''شکست و فتح'' کو پرکھنے پر اسے افسانے کے خانے میں رکھا جانا موزوں نہیں۔ اس میں کرداروں کی تفصیلی تصویر کشی ملتی ہے۔ ساتھ ہی معاشرتی مسائل اور فلسفیانہ فکر و نظر کو بھی آشکارا ہونے کا موقع ملتا ہے، نیز اس میں مختلف النوع Themes کی بھی پیش کش ہوئی ہے۔ اس لیے اسے ایک افسانہ قرار دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

اس ناولٹ میں جمیل مظہری نے مسئلہ تناسخ کو پیش کیا ہے جس کی مدد سے انھوں نے اپنے بے چین اور مضطرب احساسات و جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے۔ مسلمانوں میں عقیدہ تناسخ قطعی درست نہیں مگر شاید جمیل مظہری اپنے شدید جذبات سے مجبور تھے۔ محمود کے کردار پر کبھی کبھی خود فنکار کی مخفی

ذات کا سایہ نظر آتا ہے۔ 'شکست و فتح' میں مذکور انگنائی اور گھروندوں کی تفصیل ان کی رومانی نظموں میں بھی ملتی ہے۔ گویا یہ امر اتفاقیہ نہیں بلکہ پس پردہ کوئی حقیقت ہے جو اس رنگ میں جلوہ گر ہے۔ اس ناولٹ میں سلیمہ کا وجود چھایا ہوا ہے اور شاخ نازک کی رنگین پنکھڑی پر پڑا ہوا ایک روشن و تابناک شبنمی قطرہ ہے۔ یہ قطرہ مخالف ہوا سے اور آفتاب کی کرنوں سے لرزاں نظر آتا ہے۔ اس کردار میں ایک طرح کا درد و کرب ہے جو قارئین کو متاثر کرتا ہے۔

جمیل مظہری چند افراد کی داخلی زندگی میں اتر کر ان کی اندرونی کشمکش کو صفحۂ قرطاس پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ کچھ اس طرح کھو جاتے ہیں کہ خارجی رنگ و آہنگ کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ البتہ کہیں کہیں موسم برسات، کالے بادل اور سنکی ہواؤں کا ذکر ضرور ہوا ہے اور پھر ان کو کردار سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جمیل کے شاعرانہ احساس کی وجہ سے رعنائی فطرت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس ناولٹ کے ہیرو محمود کی زندگی شعر و ادب اور فنون لطیفہ کے گرد گھومتی ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے محبوب کے دل فریب جلوؤں کو دل کی گہرائی میں تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سجا کر رکھتا ہے۔

محمود کی ابتدائی زندگی سلیمہ کے ساتھ گھر کے آنگن اور امرود کے سائے میں بسر ہوتی ہے۔ ایام طفلی گھروندے بنانے اور پھر انھیں مٹانے میں گزرتے ہیں۔ مگر اسی خاک سے چاہت و محبت کی فصلیں لہلہا اٹھتی ہیں اور جام محبت سے سرشار یہ دونوں سرمست و بدمست پھرا کرتے ہیں۔ جب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ سلیمہ محمود سے عمر میں بڑی ہے تو ایک مشکل آن کھڑی ہوتی ہے۔ سلیمہ کو احساس ہوتا ہے کہ معاشرے اور خاندانی بندشوں کا پاس رکھنا اشد لازمی ہے۔ وہ یہاں تک سوچتی ہے کہ گرچہ ہماری ماؤں اور بہنوں نے بھی اس راہ محبت میں سرگردانی کی ہوں گی مگر جب انھیں اپنے لوگوں کی خواہشات اور معاشرے کی پابندیوں کا خیال آیا ہوگا تو اچانک اپنی خواہشیں قربان کردی ہوں گی۔ سلیمہ کے دل میں محمود کا پیار اب بھی جاگزیں ہے مگر شادی کے بعد وہ حامد سے جسمانی طور پر وابستہ ہوجانے پر مجبور ہے۔ اس کے اندر ایک کشمکش کی دنیا آباد ہے۔ پھر بھی وہ اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبھانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ البتہ ناولٹ کے اخیر میں جب محمود کی زندگی میں کج روی پیدا ہوتی ہے اور وہ غلط راستے پر گامزن ہوجاتا ہے تو سلیمہ کی روح میں ہلچل سی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ گرداب جذبات میں ہچکولے کھانے لگتی ہے۔ مگر اس کا تعقل و تفکر اس کے پائے استقامت کو متزلزل ہونے سے بچالیتا ہے۔ ہیرو محمود اپنی ناکام محبت

سے اکتا کر لمحہ ہجر اور محبوب سے دوری کو 'فلسفۂ تناسخ' سے طے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

آخر وہ کون سا پس منظر تھا جسے فن کار کو ناولٹ کی شکل میں کھل کر بیان کرنا پڑا اور پھر انھوں نے اپنی زندگی کے نقوش کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی کہ وہ جذبۂ 'حدیث دیگراں' میں مبدل ہو جاتا ہے۔ ان کی رومانی نظموں میں عذرا کا کردار بھی اہم رہا ہے۔ نظم 'ڈرو خدا سے ڈرو' پڑھیے تو یہ تناظر کچھ اور صاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح 'شکست وفتح' کی سلیمہ بھی معاشرتی قدروں اور روایتوں کا پاس رکھتی ہے، خواہ اسے اپنے جذبات کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ الگ بات ہے کہ ناولٹ کا ہیرو محمود اُسے ان فرسودہ روایتوں سے نبرد آزما ہونے کی ہمیشہ تلقین کرتا ہے۔ محمود کا کردار باغیانہ فکر ونظر کی غمازی کرتا ہے۔ حالانکہ کھل کر وہ خود بھی بغاوت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نتیجتاً شباب وشراب میں اپنے بے چین جذبوں کے لیے طمانیت تلاش کرتا ہے۔

حامد جو سلیمہ سے بہت قریب ہے، مگر سلیمہ کے نہاں خانوں میں وہ جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کرتا، جب کہ قارئین کو یہی دھن ہوتی ہے کہ پورے پلاٹ میں کہیں بھی حامد سلیمہ کی اندرونی شخصیت اور مضطرب جذبے میں جھانک کر دیکھ لیتا۔ وہ سلیمہ کے پاس رہ کر بھی دور ہی رہتا ہے۔ کیونکہ حامد اور سلیمہ کی جسمانی قربت تو ہوتی ہے مگر روحانی طور پر دونوں ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوتے۔ ہمیں سلیمہ کے کردار میں رعنائی اور حسن کی زرکاری کے ساتھ ساتھ تعقل وتفکر کے پرفریب ودلکش خطوط بھی نظر آتے ہیں۔ 'شکست وفتح' میں جمیل مظہری کی شخصیت کے خدوخال کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اس ناولٹ میں گرچہ ماجرا نگاری، جزیات نگاری اور ماحول نگاری کو فنی طور پر برتا نہیں گیا ہے۔ پھر بھی کردار نگاری میں اور خصوصاً سلیمہ کے کردار کی تراش وخراش میں جمیل مظہری کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس ناولٹ میں کردار نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر ہمایوں اشرف لکھتے ہیں:

> ''اس کے تمام کردار متحرک اور جاندار ہیں جو اپنے اعمال وافعال کے ذریعے اپنے فرائض کی ادائیگی بحسن وخوبی کرتے ہیں۔ اس کے کردار نہ صرف مثالی ہیں بلکہ زمینی بھی ہیں۔''20؎

مثالی اور زمینی کردار پر الگ سے بھی بحث ہوسکتی ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

زبان وبیان کے لحاظ سے 'شکست وفتح' میں ایک خامی یہ نظر آتی ہے کہ جمیل مظہری نے قارئین

کا خیال نہیں کرتے ہوئے سادہ اور سلیس زبان کے بدلے ثقیل اور بھاری بھرکم زبان کا استعمال کیا ہے۔ کبھی کبھی تو اس ناولٹ کا ڈکشن یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آیا یہ ناول نگاری ہے یا انشا پردازی؟ بلکہ ابتدائی حصہ میں 'تفلسف' کی پیش کش میں فلسفیانہ زبان سے ہی کام لیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ یہ فلسفے کا رنگ جمیل کی شاعری کا بھی حاوی رنگ ہے۔ اُن کی طبیعت وفطرت میں چوں کہ فلسفہ طرازی شامل ہے اس لیے کسی بھی نثری یا شعری فن پارے میں اس کا رنگ واضح طور پر ابھر آتا ہے۔ یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جو زبان سادہ اور رواں فقرے پریم چند، بیدی اور سہیل عظیم آبادی وغیرہم کے یہاں ملتے ہیں جمیل مظہری کے یہاں اس کی جستجو سعی لاحاصل ہے۔ یوں بھی دیکھا جائے تو جمیل مظہری فکشن کے شہسوار نہیں بلکہ شاعری کے مرد میدان تھے۔ انھوں نے فکشن کی زبان یا اس کے اسلوب پر توجہ بھی نہیں کی۔ لیکن، سب کچھ کے باوجود 'شکست وفتح' کی زبان عام نثر کی زبان سے قطعی علاحدہ مزاج رکھتے ہوئے بھی اثر آفریں اور دلچسپ ہے۔

طنزیات وفکاہات

جمیل مظہری کے فکاہیہ کالم بھی بہت پڑھے جاتے تھے۔ 'کٹوری میں گنگا' کے عنوان سے انھوں نے ایسی نگارشات چھوڑی ہیں۔ ایک فکاہیہ تحریر 'طوائف کی ضرورت متمدن دنیا میں' کے عنوان سے ہے۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر طوائف کا وجود نہ ہوتو اور بھی زیادہ فساد اور انتشار کا خدشہ ہے۔ نوجوانوں کے جوش جذبات کا علاج آخر کیا ہے؟ اس مضمون کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے:

> ''طوائف کیا ہے؟ تہذیب کی پیشانی پر ایک خوشنما داغ، تمدن کے شفاف چہرے پر ایک خال سیاہ، شبستانِ نشاط کی وہ پروانہ نواز شمع جس نے جلنا نہیں سیکھا۔ صرف جلانا جانتی ہے...''

اور مضمون کے ختم ہونے سے پہلے لکھتے ہیں:

> ''طوائف فطرت کے ہاتھ میں ایک خوبصورت حربۂ انتقام ہے۔ وہ پرغرور سر جس میں غریبوں پر حکومت کرنے کا تند خیال بھرا ہوتا ہے، جب کسی حسین 'دختر گناہ' کے مہندی لگے پاؤں سے ٹھکرایا جاتا ہے تو ملکۂ فطرت کھلکھلا کر ہنستی ہے۔''

جمیل مظہری نے اپنے اس مضمون کو مجنونانہ فلسفۂ اخلاق بھی کہا ہے لیکن ان کا ماننا ہے کہ جب طوائف کی ضرورت ناگزیر ہے تو اس مضمون کو 'طوائف زندہ باد' کے نعروں کے ساتھ ختم کرنا چاہیے۔

جمیل مظہری کی فکاہیہ تحریروں میں طنز کی کاٹ بہت شدید ہو جاتی ہے۔ کلکتہ کی سرزمین پر جمیل مظہری کے عہد میں طوائفوں کے اڈے پر ادبا و شعرا اور سماج کے ہر طبقے سے وابستہ حضرات کی حاضری ہوا کرتی تھی۔ جمیل کے مشاہدے میں جو کچھ بھی آیا، اُسے شاعری اور نثر دونوں اسالیب میں پیش کرتے رہے۔ صحافیوں پر جم کر حملے کیے۔ 'کٹوری میں گنگا' سیریز کی نگارشات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمیل مظہری نے اپنے عہد کی سماجی و سیاسی اتھل پتھل سے پیدا ہونے والے موضوعات پر جی کھول کر لکھا۔ کہیں کہیں ان کی اس نوع کی تحریروں میں شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ صورت حال مضحکہ خیز بھی ہو جاتی ہے۔ جارحانہ اسلوب میں کبھی کبھی مزہ بڑھ جاتا ہے لیکن اس میں ٹھہراؤ کم ہوتا ہے۔ جارحیت اور تضحیک و تذلیل کا یہ اندازہ جمیل کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ نثر میں زبان کا خوبصورت استعمال جمیل کے جمالیاتی رنگ کو نکھار دیتا ہے۔ جمیل مظہری اپنے اس طرز نگارش کو تفریحی عمل سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نوع کی تحریروں کے حوالے سے جناب نورالہدیٰ صاحب لکھتے ہیں:

> ''مظہری کا یہ طرز تحریر مولانا آزاد اور نیاز فتح پوری کی طرز نگارش سے ہم آہنگ ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور فکر و فن اور پیغام کے اعتبار سے بھی۔''21؎

وہ فکاہیہ کالم صرف تفریح کے لیے نہیں لکھتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اسے ایک تفریحی عمل ہی کہا ہے، بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہوتا تھا۔ ان کے طنز کا نشتر سماج کے کسی نہ کسی گھاؤ کی جراحی ضرور کرتا ہے۔ آخر میں پروفیسر شہزاد انجم کے اس قول پر اپنی بات ختم کرتا ہوں جو کہ مجھے برمحل معلوم ہوتا ہے:

> ''انھوں نے اپنے آس پاس رائج فرسودہ رسم و رواج کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، ظریفانہ لہجے میں ان پر نکتہ چینی بھی کی، مگر ایک مفکر اور عالم کی طرح جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں کشش پیدا ہو گئی ہے۔''22؎

حواشی

1. کلیاتِ جمیل مظہری، جلد چہارم، 2012، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ص421
2. ایضاً، ص422
3. ایضاً، ص427
4. بحوالہ: مظہر جمیل از کوثر مظہری، ص369
5. ایضاً، ص369
6. ایضاً، ص387
7. ایضاً، ص390
8. ایضاً، ص393
9. ایضاً، ص399
10. ایضاً، ص432
11. ایضاً، 441
12. ایضاً، ص454
13. کلیاتِ جمیل مظہری جلد چہارم، حصہ دوم، ص458
14. ایضاً، ص628
15. ایضاً، ص36-633
16. بحوالہ: مظہر جمیل از کوثر مظہری، 2014، ص322
17. بحوالہ منثورات جمیل مظہری حصہ اوّل، ص16، مرتب: ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، بہار اردو اکادمی، 1991
18. کلیاتِ جمیل مظہری، جلد چہارم، ص171
19. ایضاً، ص173
20. بحوالہ مظہر جمیل، مرتب: کوثر مظہری، 2014، ص330
21. ایضاً، ص346
22. ایضاً، ص355

❋

باب چہارم

انتخابِ نگارشات

نظمیں:

شاعر کی تمنا

اگر اس گلشنِ ہستی میں ہونا ہی مقدر تھا
تو میں غنچوں کی مٹھی میں دلِ بلبل ہوا ہوتا

گناہوں میں ضرر ہوتا، دعاؤں میں اثر ہوتا
محبت کی نظر ہوتا، حسینوں کی ادا ہوتا

فروغِ چہرۂ محنت، غبار دامنِ دولت
نمِ پیشانئِ غیرت، خمِ زلفِ رسا ہوتا

ہوا ہوتا کسی دستارِ کج پر پھول کا طرہ
اور اس دستارِ کج کی تمکنت پر ہنس رہا ہوتا

کسی مغرور کی گردن پہ ہوتا بوجھ احساں کا
کسی ظالم کے دل میں درد ہوکر لادوا ہوتا

کسی منعم کے چہرہ پر خوشی حاجت روائی کی
کسی نادار کی نظروں میں شرمِ التجا ہوتا

کسی بھٹکے ہوئے راہی کو دیتا دعوتِ منزل
بیاباں کی اندھیری شب میں جوگی کا دِیا ہوتا

کسی کے کلبہ احزاں میں شمعِ مضمحل بن کر
کسی بیمار مفلس کے سرہانے رو رہا ہوتا

شرر بن کر کسی نادار گھر کے سرد چولھے میں
''بصد اُمیدِ فردا'' زیرِ خاکستر دبا ہوتا

یتیم بے نوا کی رہگزر پر اشرفی بن کر
لئیم فاقہ کش کی جیب ممسک سے گرا ہوتا

نیستاں سے نکل کر حسرت آبادِ تمدن میں
گدائے پیر و نابینا کے ہاتھوں کا عصا ہوتا

شکستہ جھونپڑے میں بانسری دہقان کی بن کر
سکوتِ نیم شب میں رازِ ہستی کہہ رہا ہوتا

غرض اس حسرت واندوہ ویاس وغم کی بستی میں
کہیں درد آفریں ہوتا، کہیں درد آشنا ہوتا

''ڈبویا مجھ کو ہونے نے'' بقولِ غالبؔ دانا
''نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا''

فسانۂ آدم

میں تھا ضمیرِ مشیت میں ایک عزم جلیل
ہنوز شوق کی کروٹ بھی لی نہ تھی میں نے

کہ دفعتاً متحرک ہوئے لبِ تخلیق
پکڑ لی صورتِ ظاہر وجود کی میں نے

وہ صبحِ عالمِ حیرت وہ جلوہ زارِ بہشت
ہوا چمن کی لگی آنکھ کھول دی میں نے

وہ تربیت گہ ذوقِ نظر، وہ وادیٔ نور
جہاں سے پائی محبت کی روشنی میں نے

وہ عنفوانِ تمنا وہ ابتدائے جنوں
وہ اک خلش جسے سمجھا تھا زندگی میں نے

کیا سرور نے اک عالم دگر پیدا
چرا کے پی جو مئے سرکشِ خودی میں نے

خودی کے نشہ میں اللہ رے بےخودی میری
بدن سے چادرِ عصمت بھی پھینک دی میں نے

ہوا حدودِ نظر سے نکل کے آوارہ
ہوائے شوق میں جنت بھی چھوڑ دی میں نے

فرشتے رہ گئے حیرت سے دیکھتے مجھ کو
نہ کی قبول مشیت کی رہبری میں نے

دلیل راہ بنی اپنی گرمیٔ پرواز
کہ طاقتِ پرِ جبریل چھین لی میں نے

بڑھیں ستاروں کی دُنیائیں میرے لینے کو
اُتر کے عرش سے نیچے نظر جو کی میں نے

مگر زمیں کی کشش نے سوئے زمیں کھینچا
کیا پسند یہ زندانِ عنصری میں نے

جگہ ملی جو تڑپنے کی بیقراری کو
تو پھر حدود میں وسعت کی داد دی میں نے

ہوا تلاطمِ ہستی بہ عالمِ ذرّات
چھڑک دی خاکِ بیاباں پہ زندگی میں نے

نمو کے جوش سے سودائے رنگ و بو نکلا
زمیں کے دل کی تمنا نکال دی میں نے

بہک بہک کے بکھیرے، یہاں وہاں سجدے
بھٹک بھٹک کے حقیقت تلاش کی میں نے

ہوئیں جہانِ عمل میں شریعتیں پیدا
خدا کے نام پہ برپا جو کی خودی میں نے

کبھی جلائی اندھیرے میں شمعِ علم و عمل
کبھی بجھا دی ہدایت کی روشنی میں نے

کبھی بگاڑ کے رکھ دیں ثواب کی شکلیں
کبھی بدل دی حقیقت گناہ کی میں نے

بڑھا تو رہ گیا پیچھے مرے زمانۂ حال
رُکا تو وقت کی رفتار روک دی میں نے

زمیں پہ شوق کے فتنے بچھا دیئے ہرسو
فضا میں نیند کی مستی بکھیر دی میں نے

کبھی جگادی قیامت نفس کی ٹھوکر سے
اٹھا کے صورِ سرافیل زندگی میں نے

اٹھیں محیطِ فنا سے حیات کی موجیں
اجل کی گود میں انگڑائی ایسی لی میں نے

جنوں کے جوش میں پردے نظر کے چاک کیے
نقاب نوچ کے فطرت کی پھینک دی میں نے

قبائے لیلیٰ تہذیب چاک کرڈالی
ردائے مریم عصمت اُتار لی میں نے

نظام فطرتِ کبریٰ کا کردیا برہم
نگاہ فتنۂ دوراں کی موڑ دی میں نے

مزاجِ آتشِ سوزاں کو کردیا ٹھنڈا
مچا دی بزمِ عناصر میں کھلبلی میں نے

لیا شہنشۂ خاور سے روشنی کا خراج
کیا اسیر طبیعت کو برق کی میں نے

بہ انقلابِ طبیعت مزاجِ آہن کو
ہوا کی گرمیٔ پرواز بخش دی میں نے

بلندیوں کا تصور بھی رہ گیا پیچھے
پہنچ کے اتنی بلندی پہ سانس لی میں نے

ٹھٹک گئیں جو نگاہیں قریبِ تجلۂ قدس
پسِ حجابِ ادب یہ صدا سنی میں نے

کہ اے حریفِ مشیت بہ وعدہ گاہِ ازل
ٹھہر ٹھہر، تری پرواز دیکھ لی میں نے

اپنا تعارف

دو جمیلؔ اک جمیلؔ کے اندر
یہ تضاد اور یہ دوئی کیوں ہے

یعنی جب ہے وہ منکر ادیان
ذہن پھر اس کا مذہبی کیوں ہے

کرشن و عیسیٰ و محمدؐ سے
اس قدر خوش عقیدگی کیوں ہے

مدح کنفیوشس اور گوتم کی
سِکھ نہیں پھر بھی نانکی کیوں ہے

وہ مسلمان تو نہیں بے شک
پھر حسینی و حیدری کیوں ہے

جب خدا پر ہے اعتقاد اسے
تو عبادت سے سرکشی کیوں ہے

اشتراکی بھی وہ نہیں لیکن
مسلک اس کا برابری کیوں ہے

زہد کو بھی غلط سمجھتا ہے
بزمِ رنداں سے بے رخی کیوں ہے

ہر تمنا سے اجتناب یہ کیا — ہر تماشے میں اجنبی کیوں ہے
دوستی پر یقین رکھتا ہے — آپ اپنے سے دشمنی کیوں ہے
اپنے جذبوں پہ آپ ہی نظریں — اس میں اتنی خودآگہی کیوں ہے
تیرگی سے بھی اس کو ہمدردی — روشنی سے یہ ناخوشی کیوں ہے
ایک خود کام احتیاط کے ساتھ — اک خود آوردہ مفلسی کیوں ہے
ایک خود اختیار ضبط کے ساتھ — خود فراموشِ آگہی کیوں ہے
پدرانہ مزاج میں اس کے — اک یتیمانہ عاجزی کیوں ہے
روشنی میں بھی اک اندھیرا پن — راستی میں بھی اک کجی کیوں ہے
اس کے اللہ سے کوئی پوچھے — اس کی سیرت میں یہ کمی کیوں ہے
اس کے ایثار میں بھی ہے پندار — یہ خودی ہے تو بے خودی کیوں ہے
جب طبیعت میں انفعال سا ہے — دین و دنیا سے برہمی کیوں ہے
دل تہی نفرت و محبت سے — کوئی پوچھے کہ آدمی کیوں ہے

مظہریؔ خود بھی سوچتا ہے یہی
مظہریؔ کیا ہے مظہریؔ کیوں ہے

فراق سی سالہ

(ایک منظوم افسانہ)

میری عذرا، میری شمعِ فکر وفن کی روشنی — میری عذرا، میرے ماضی کے کھنڈر کی چاندنی
میری عذرا، میری رفتارِ جنوں کی رہنما — دیکھ تو پہنچا کہاں عمرِ رواں کا قافلہ
وقت کی رو اب بدل سکتی نہیں رستہ کہیں — میرے نقش پا کہیں ہیں، تیرے نقش پا کہیں
تجھ کو ہے ہر چند اپنی بے وفائی کا ملال — پھر بھی نادانی ہے تجدیدِ تعلق کا خیال
اب پلٹ سکتا نہیں آواز دینے سے شباب — ریگ زارِ زندگی میں اب اٹھیں گے کیا حباب

صبر اک جبرِ مشیت، جبر کی غایت ہے صبر — ہجر جب ہو مستقل تو اک بڑی نعمت ہے صبر
وقت کو پچھلے قدم لوٹا نہیں سکتا کوئی — اپنی پچھلی زندگی دہرا نہیں سکتا کوئی
عشق نقشِ آب ہے، ہر شوق نقش آب ہے — زندگی خاشاک ہے اور وقت اک سیلاب ہے
ہم تو دو تنکے تھے اک سیلِ رواں میں بیش وکم — اتفاقاً کردیا تھا جن کو لہروں نے بہم
موج نے کروٹ جو لی صحبت وہ برہم ہوگئی — وصل کی وہ لحظگی تقدیرِ شبنم ہوگئی
اپنی اب پونجی ہے کیا جز شدتِ احساس حال — آہ وہ عہد محبت جس پہ گذرے تیس سال
کتنے طوفاں، کتنے دریا، کتنے دھارے بیچ میں — کتنے ذہنی فاصلے ہیں اب ہمارے بیچ میں
جب تصور پھاندتا ہے بیچ کی دیوار کو — دیکھتا ہوں تیرے کمھلائے ہوئے رخسار کو
دیکھتا ہوں سر کی چادر دوش پہ ڈھلکی ہوئی — دیکھتا ہوں تیری چشم سرگیں چھلکی ہوئی
لیکن اس سن میں گریباں چاک کرسکتا نہیں — کھول کر جی ایک ٹھنڈی سانس بھرسکتا نہیں
اشک آنکھوں میں اگر آتے ہیں پی لیتا ہوں میں — زخم کا ٹانکا اگر ٹوٹا تو سی لیتا ہوں میں
میری مجبوری سے کم کچھ تیری مجبوری نہیں — ذہن کی اک منطقی رَو ہے یہ مہجوری نہیں
بس یہی منطق نتیجہ جس کا اخلاقی شعور — دو دلوں کو انتہائے شوق میں رکھتی ہے دور
عشق کے فطری تقاضوں کو سلا دیتی ہے یہ — دل کی ہر وحشت کو زنجیریں پنہا دیتی ہے یہ
جب نہیں ٹوٹیں یہ زنجیریں تو اب ٹوٹیں گی کیا — دل کھنڈر ہے اب تمنائیں اسے لوٹیں گی کیا
اک امیدِ مضمحل نے شکل دکھلائی تو کیا — دو گھڑی کو اس کھنڈر میں چاندنی آئی تو کیا
ہاں یہ سچ ہے زخمِ دل مرجھا نہیں سکتے کبھی — پھر بھی وہ لمحے پلٹ کر آ نہیں سکتے کبھی

بھول جا اس اتصالِ عارضی کو بھول جا
بھول جا عذرا اب اپنے مظہریؔ کو بھول جا

رخصت

[نوٹ: اس نظم میں ایک بوڑھا شاعر دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنی محرومیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر رہا ہے۔ اس لیے آپ اس کو اعترافِ شکست بھی کہہ سکتے ہیں اور شکستِ آواز بھی۔]

شہیدِ لعنتِ فکرِ فضول جاتا ہے
شہید فرض، شہید اصول جاتا ہے
چلا مجاہدِ مجروح کارزار چلا
ستم نواز، کرم ہائے روزگار چلا
خرد نے دل سے کہا، لے ترا شکار چلا
نظر نظر میں لیے عالمِ غبار چلا
چلا مسافر صحرائے اعتبار چلا

شعور کو کفن اخلاق کا پنہائے ہوئے
بدوش فرض محبت کی لاش اُٹھائے ہوئے
لحد میں دل کی تمناؤں کو سلائے ہوئے
جنوں کو عقل کا دیتا ہوا وقار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا

حقوقِ خیر و خراجِ گناہ دے نہ سکا
کرشمے تابہ دل آئے، پناہ دے نہ سکا
اک آہ دے نہ سکا، اک نگاہ دے نہ سکا
رہِ طلب میں اُڑاتا ہوا غبار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا

جنوں بھی، عقل بھی، رندی بھی، ارتقا بھی خفا
حسد بھی،خلق بھی، اخلاق بھی، ریا بھی خفا
عجب دماغ تھا شیطان بھی، خدا بھی خفا
بلاتی رہ گئی دنیائے نور و نار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا

شکایتوں کا اک انبار ساتھ ساتھ لیے
صد احتجاج و صد انکار ساتھ ساتھ لیے
شکوک و طنز کے سوخار ساتھ ساتھ لیے
جگر کے گھاؤ کو کرتا ہوا شمار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا

قدم قدم پہ اسے سایۂ شجر بھی ملے
محل کی چھت بھی ملی، میکدے کے در بھی ملے
ٹھہر سکا نہ کہیں گو خدا کے گھر بھی ملے
کہیں جگہ نہیں جس کی وہ بے عیار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا

نہ شاعری سے ملا کچھ، نہ فلسفے سے ملا
نہ میکدے سے ملا کچھ، نہ مدرسے سے ملا
نہ ایک داغِ جبیں بھی صنم کدے سے ملا
طرب کدوں سے بھی بے کیف و بے خمار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا

غرض حیات کے اک نوحہ خواں کی رخصت ہے
جمیؔل گردِ رہِ کارواں کی رخصت ہے
تپش نصیبِ غمِ دوستاں کی رخصت ہے

کسی کو جس کا نہیں غم وہ غم گسار چلا
چلا مسافرِ صحرائے اعتبار چلا
سرابِ دانشِ بے اعتبار دے کے چلا
غبار دے کے چلا اور غبار لے کے چلا

—•—

مریضِ محبت

اپنے پندارِ خودی سے منفعل ہوں مظہریؔ   میں ظہورِ اختلالِ آب و گِل ہوں مظہریؔ
کہ محبت کا مریضِ مستقل ہوں مظہریؔ
دوستی کیا دشمنی سے بھی محبت میں نے کی   روشنی کیا تیرگی سے بھی محبت میں نے کی
مسکرائی تیرگی مجھ کو محبت ہوگئی   ہنس کے بولی دشمنی مجھ کو محبت ہوگئی
مفلسی و بے نوائی سے محبت میں نے کی   ہر سرورِ خودنمائی سے محبت میں نے کی
ہر غرورِ کبریائی سے محبت میں نے کی   بے رخی و کج ادائی سے محبت میں نے کی
تر زباں ہوکر رکھائی سے محبت میں نے کی
تھا رجائی کس قدر میری محبت کا دماغ   اہرمن کے سینۂ تاریک میں دیکھا چراغ
اک ستارستاں نظر آیا اندھیرا داغ داغ
میں نے مکاری وعیاری میں بھی دیکھا خلوص   میں نے صیادی و جلادی سے بھی برتا خلوص
میں نے قہاری و جباری میں بھی ڈھونڈا اخلوص
اپنے اس جذبے کو اک تشدیدِ ایمانی بھی دی   دوستوں کے واسطے ایماں کی قربانی بھی دی
تاکہ پوری ہو محبت کی اک امیدِ فضول   بارہا جھونکا کیا انصاف کی آنکھوں میں دھول
پھر بھی سب کچھ کھو کے سب کچھ دے کے کچھ پایا نہیں   عقل کام آئی نہیں اور عشق راس آیا نہیں
جس کو کہتے ہیں وفا اک سخت بیماری ہے یہ   خودکشی ہو یا نہ ہو لیکن خود آزاری ہے یہ

ناز برداری میں بھی اک بار برداری ہے یہ
میں محبت کی ہوس میں اتنا بیخود ہوگیا   میرے اندر مادّہ نفرت کا بالکل سوگیا
اے عزیزو! اِس مریض زندگی کا کیا علاج   اس خودی کا کیا علاج، اس بیخودی کا کیا علاج
جس کو ہو نازِ وفا اس آدمی کا کیا علاج   اجتبیٰ سے پوچھتے ہو مظہریؔ کا کیا علاج
سو خلوص بے ریا کا اک خباثت سے علاج   یہ مرض ہے، یہ مرض ہے اس کا نفرت ہے علاج
بس یہی راز شفا ہے، بس یہی رازِ شفا   بس یہی میری دوا ہے، بس یہی میری دوا
کوئی میری روح پر ایسا کرے ظلمِ شدید
مجھ میں نفرت جی اٹھے صلوٰۃ بر روحِ یزید

—•—

مریضِ نفرت

میں ہوں اک مریضِ نفرت، مرا ذہن ہے قنوطی، میں گرا ہوں آسماں سے میں ہبوطی ہوں ہبوطی
میں سلگ رہا ہوں نفرت کے شرارِ مشتعل سے، یہ دھواں جو اٹھ رہا ہے، مرے سوزِ منفعل سے
ہے اسی کا نام نفرت، ہو تجھے سلام نفرت
کہ چھڑا دیا محبت کے عذابِ مستقل سے، یہ صدائیں آرہی ہیں مرے شعلہ زار دل سے
میں ہوں اک مریضِ نفرت
مجھے دو جہاں سے نفرت، مجھے اس زمیں سے نفرت، مجھے آسماں سے نفرت
میں بلندیوں سے نالاں، مجھے پستیوں سے نفرت، مجھے ہوشیاریوں سے مجھے مستیوں سے نفرت
غمِ دیں غمِ معاش اور غمِ دوسرا سے نفرت۔ مجھے مفلسی سے نفرت، مجھے اغنیا سے نفرت
مجھے رند سے ہے نفرت، مجھے پارسا سے نفرت
میں ہوں اک مریضِ نفرت
جو گھٹا سے مجھ کو نفرت، تو ہوا سے مجھ کو نفرت
میں گھٹا سے لڑ رہا ہوں، میں ہوا سے لڑ رہا ہوں، میں خدا سے لڑ رہا ہوں

ہے خودی سے مجھ کو نفرت، ہے خدا سے مجھ کو نفرت
میں ہوں اک مریض نفرت
مجھے زہد سے بھی نفرت، مجھے فسق سے بھی نفرت، مجھے عقل سے بھی نفرت
مجھے عشق سے بھی نفرت
مجھے عارضِ درخشاں کی شعاعوں سے بھی نفرت، مجھے گیسوئے پریشاں کی گھٹاؤں سے بھی نفرت
مجھے دھوپ سے بھی نفرت، مجھے چھاؤں سے بھی نفرت
مجھے روپ سے بھی نفرت، مجھے رنگ سے بھی نفرت، مجھے شیشگی سے نفرت، مجھے سنگ سے بھی نفرت، میں
ہوں اک مریضِ نفرت
مجھے دشمنی سے نفرت، مجھے دوستی سے نفرت، مجھے آگہی سے نفرت، مجھے جاہلی سے نفرت
عرفا سے مجھ کو نفرت، جہلا سے مجھ کو نفرت
مجھے سوچ سے بھی نفرت، مجھے دھیان سے بھی نفرت، مجھے گُن سے بھی ہے نفرت
مجھے گیان سے بھی نفرت
مجھے پُن سے بھی ہے نفرت، مجھے پاپ سے بھی نفرت، مجھے آپ سے بھی نفرت
مجھے آئینے سے نفرت، مجھے اپنے رخ سے نفرت
مجھے اپنے دل سے نفرت، دلِ مضطرب سے نفرت، سرِ منفعل سے نفرت
میں ہوں اک مریضِ نفرت
مجھے دشت و در سے نفرت، مجھے خیر و شر سے نفرت
مجھے راکشس سے نفرت، مجھے دیوتا سے نفرت، مجھے دوستوں سے نفرت
مجھے اقربا سے نفرت، میں ہوں اک مریض نفرت
ہے یہی مری حقیقت، ہو کہیں اگر محبت تو مرا علاج کر دے
جو مزاج میرا پہلے تھا وہی مزاج کر دے

—•—

اُسے بھول جا بھُلا دے

یہ سمجھ لے خواب دیکھا تھا نشاطِ زندگی کا
یہ سمجھ لے وہ محبت نہیں کھیل تھا کسی کا
کہ بھرا تھا اِک کھلاڑی نے سوانگ عاشقی کا
ہوا ختم جب تماشہ تو نہ پردہ کیوں گرا دے — اسے بھول جا بھلا دے
وہ نگاہیں ان نگاہوں سے دوچار کب ہوئی تھیں
وہ کلائیاں گلے کا ترے ہار کب ہوئی تھیں
وہ لگاوٹیں محبت کا سنگار کب ہوئی تھیں
یہ تصوراتِ باطل کے نقوش ہیں مٹا دے — اسے بھول جا بھلا دے
یہ نہ پوچھ اُس سے ناداں کہ ہو مجھ سے سرگراں کیوں
رہی جاتی ہے ادھوری یہ وفا کی داستاں کیوں
یہ سکوتِ منفعل کیا؟ یہ حجابِ درمیاں کیوں
جو سوال ''پردہ در'' ہو تو جواب کوئی کیا دے —اسے بھول جا بھلا دے
یہ چراغ تیز جھونکوں میں جلا کرے گا کیونکر
ہے وفا پہ ناز تجھ کو تو وفا کرے گا کیونکر
جو حقوق ہیں محبت کے ادا کرے گا کیونکر
نہ وہ دل کو زندگی دے، نہ وہ غم کو حوصلہ دے — اسے بھول جا بھلا دے
جو چُبھے ہیں دل میں کانٹے تو کھٹک کے کیا کریں گے
جو ٹپک رہے ہیں آنسو تو ٹپک کے کیا کریں گے
جو لپک رہے ہیں شعلے تو لپک کے کیا کریں گے
ہو خودی ذرا بھی تجھ میں تو اس آگ کو بجھا دے —اسے بھول جا بھلا دے
یہ وہ سوز ہی نہیں ہے یہ وہ لاگ ہی نہیں ہے

جو رسا نہ ہو محبت کی وہ آگ ہی نہیں ہے
تری بانسری کے سینے میں وہ راگ ہی نہیں ہے
جو کسی کے دل کی سوئی ہوئی راگنی جگا دے —اسے بھول جا بھلا دے

جسے ہوش ہو، اشاروں پہ جنوں کے وہ چلے کیوں؟
نہ رہا کوئی تعلق تو جفائیں وہ کرے کیوں؟
جو تپش کا ہو نہ قائل وہ جلائے کیوں جلے کیوں؟
جو وفا کو جرم سمجھے، وہ وفا کا کیا صلہ دے —اسے بھول جا بھلا دے

یہ کمال بے نیازی یہ مآل زندگانی
کہ سراب کی پرستش میں گذار دی جوانی
تو وہ تشنہ کام دل ہے کہ ملا نہ جس کو پانی
تری گمرہی کی فطرت تجھے داد دے تو کیا دے—اسے بھول جا بھلا دے

کئے قرض ادا محبّت کے بہ التزام تونے
کہ جبیں کی ہر شکن کا کیا احترام تونے
لیا زندگی کے بدلے یہ غمِ دوام تونے
دلِ زار اس محبّت کی خدا تجھے جزا دے —اسے بھول جا بھلا دے

—•—

یہ کیا ہوا تم کو

یہ کیا ہوا مری عذرا، یہ کیا ہوا تم کو
نظر اٹھاؤ خدا را، یہ کیا ہوا تم کو
یہ کیوں بدل گئی دنیا، یہ کیا ہوا تم کو
مری نظر سے اب آنے لگی حیا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

تمہاری آنکھ سے بیگانگی ٹپکتی ہے
نیاز و ناز سے اک بے دلی ٹپکتی ہے
رُخ اِس طرف ہے مگر بے رخی ٹپکتی ہے
وہ کیا کرے کہ جو پاکر نہ پاسکا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

کہے گا کچھ دلِ درد آشنا اِدھر دیکھو
بہ جانِ عشق و بحقِ وفا اِدھر دیکھو
نگاہِ ناز کا صدقہ ذرا اِدھر دیکھو
پیام دیتی ہے کچھ چشمِ التجا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

مری نظر ہے یہ برچھی کی کچھ انی تو نہیں
نگاہِ یاس محبت ہے کچھ چھری تو نہیں
دل و جگر میں تمہارے کبھی چبھی تو نہیں
نظر اٹھاؤ، محبت کہے گی کیا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

وفا کے رنگِ طبیعت سے کیا گلہ ہے تمہیں
ادائے رسمِ محبت سے کیا گلہ ہے تمہیں
نیازِ عشق کی جرأت سے کیا گلہ ہے تمہیں
نگاہِ شوق نے کیا کردیا خفا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

یہ سچ ہے بڑھ گئی حد سے ہماری بیتابی
بکھیرے جاتی ہے سجدے ہماری بیتابی
تمہارے ضبط پہ صدقے ہماری بیتابی

اسی نے کردیا بیگانۂ ادا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

اِن آنکھوں میں دلِ خود دار اب نہیں آتا
لبوں پہ خندۂ انکار اب نہیں آتا
مرے جنوں پہ تمھیں پیار اب نہیں آتا
یہ کس نے پیکرِ سنگیں بنا دیا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

زبانِ شوق و لبِ مدعا سے برہم ہو
مری نگاہ سے، اپنی ادا سے برہم ہو
سرک گیا ہے جو آنچل ہوا سے برہم ہو
کسی نے یوں نہیں دیکھا کبھی خفا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

محبت ایک فریبِ ادا سے بھی محروم
تبسمِ نگۂ آشنا سے بھی محروم
بقولِ غالبِ دانا جفا سے بھی محروم
یہی وفا ہے تو آتی نہیں وفا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

تمھیں بتاؤ کہ شوخی اگر حیا ہوجائے
روا جو بات تھی بے وجہ ناروا ہوجائے
جب اک ذرا سا تبسم بھی مرحلہ ہوجائے
تو کیا کہے دلِ مایوس مدعا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

یہ کیا عتاب ہے شکرِ جفا تو کرنے دو

خلوصِ عشق کے سجدے ادا تو کرنے دو
گناہگارِ وفا کو وفا تو کرنے دو
پرائے درد کا احساس دے خدا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

لبوں پہ مہر سہی ابروؤں سے کام تو لو
میں جارہا ہوں، مرا آخری سلام تو لو
ان آنسوؤں میں جو غلطاں ہے وہ پیام تو لو
مسافروں سے کدورت نہیں روا تم کو
یہ کیا ہوا تم کو

—•—

ڈرو خدا سے ڈرو

(ایک جوان عورت جس کی جوانی بڑھاپے کی گود میں بسر ہورہی ہے۔ ایک نوجوان کی محبت میں مبتلا ہوکر اپنے چاہنے والے سے یوں فریاد کرتی ہے)۔

ہوس کی آگ بجھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
سنو جمیلؔ سنو! تم سے یہ گذارش ہے
یہ آرزو نہیں، دل سے نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
اسے جنوں نہ بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
یہ تم جو مجھ کو تصور میں پیار کرتے ہو
جو نام لے کے مرا آہ سرد بھرتے ہو
تمھیں خبر بھی ہے کیا مجھ پہ کرگزرتے ہو

نہ جذب دل کو بڑھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
یہ کیا کہ دل میں کسی کے سمائے جاتے ہو
رگوں میں خوں کا تموج بڑھائے جاتے ہو
ہر ایک بوند کو آنسو بنائے جاتے ہو
کسی کو یوں نہ گھلاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
جھکائے سر کو جو بیٹھوں تو تم نظر آؤ
کبھی کتاب جو کھولوں تو تم نظر آؤ
اُٹھا کے آئینہ دیکھوں تو تم نظر آؤ
نہ یوں نظر میں سماؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
کسی دن آئینہ خانہ میں جب سنورتی ہوں
تمہارے شوقِ تماشا کو یاد کرتی ہوں
تمہاری آنکھ سے کیا اپنے دل سے ڈرتی ہوں
نہ بے حجاب بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
اِدھر اُدھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
ہلیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
جو پاس چولھے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں، سالن کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر دال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دوانہ بناؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
نہ اِس طرح مجھے رسوا کرو خدا کے لیے
لگائی آگ کو ٹھنڈا کرو خدا کے لیے

رعایتِ دلِ عذرا کرو خدا کے لیے
وفا کو آگ لگاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
جھنجھوڑ کر نہ جگاؤ کہ سوگیا ہے یہ دل
کئی برس سے عزاخانۂ وفا ہے یہ دل
خدا گواہ کسی کی محل سرا ہے یہ دل
پرائے گھر میں نہ آؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
جو بجھ رہا ہو سرِ شام وہ دیا ہوں میں
تبسمِ لبِ مایوس مدعا ہوں میں
حیا کے دوش پہ اک میتِ وفا ہوں میں
مرے قریب نہ آؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
نیاز بے ادب آرزو معاذاللہ
کنارِ شوق و لبِ آرزو معاذ اللہ
میں اور عروسِ شبِ آرزو معاذ اللہ
نہ ایسے خواب دکھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
ہے فرض کا یہ تقاضا جلا کروں تا عمر
حیاتِ رفتہ کا ماتم کیا کروں تا عمر
کسی کے نام کا کلمہ پڑھا کروں تا عمر
نیا سبق نہ پڑھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
جو گھٹ کے ساز میں رہ جائے وہ صدا ہوں میں
نہ درد سے نہ محبت سے آشنا ہوں میں
یہی سمجھ لو کہ کم بخت بے وفا ہوں میں
مجھے وفا نہ سکھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو
کہاں رکھوں دلِ خانہ خراب کی میّت

کنوارے پن کے پُرارمان خواب کی میّت
میں خود اٹھاؤں گی اپنے شباب کی میّت
نہ ہاتھ اپنے لگاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو

میں دل میں بیج محبت کا بو نہیں سکتی
حیا کا نام ڈبو دوں، ڈبو نہیں سکتی
کسی طرح بھی تمہاری میں ہو نہیں سکتی
میں صدقے جی نہ کڑھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو

ہمارے دل میں اب ارمان پل نہیں سکتے
اگر پلیں بھی تو کروٹ بدل نہیں سکتے
شکستہ ساز سے نغمے نکل نہیں سکتے
اب اس کو پھر نہ بجاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو

میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمہیں خدا کی قسم
شکستہ حالیٔ عذرائے بے وفا کی قسم
جو جل رہی ہو بتدریج اُس چتا کی قسم
ہوس کی آگ بجھاؤ، ڈرو خدا سے ڈرو، مجھے نہ یاد کرو

غزلیں

صبح خود بتائے گی، تیرگی کہاں جائے   یہ چراغ کی جھوٹی روشنی کہاں جائے
جو نشیب آئے گا راستہ دکھائے گا   موڑ خود بتائے گا آدمی کہاں جائے
بڑھ کے دو قدم تو ہی اس کی پیٹھ ہلکی کر   یہ تھکا مسافر اے رہزنی کہاں جائے
ہاؤ ہو کی دنیا میں، ماو تو کی دنیا میں   رنگ و بو کی دنیا میں سادگی کہاں جائے
بے تعلقی مسلک ہوچکا ہے دنیا کا   دوستی کہاں جائے، دشمنی کہاں جائے

اب تو دھوپ آ پہنچی جھاڑیوں کے اندر بھی   اب پناہ لینے کو تیرگی کہاں جائے
کارواں نے چولھوں میں جھونک دی گھنی شاخیں   اب کہیں نہیں سایہ خستگی کہاں جائے
زخمِ دل تو کیا دوگے داغِ سجدہ ہی دے دو
اب تمہاری چوکھٹ سے مظہری کہاں جائے

کبھی سجدہ نہ کرایا کبھی سجدہ نہ کیا   ہم نے احساسِ ضرورت تجھے رسوا نہ کیا
تجھ سے ممکن جو نہ تھا اس کا تقاضا نہ کیا   ہم نے اے چشم مروّت تجھے نیچا نہ کیا
ایک دھجّی نہ ملی میرے گریباں کی اسے   فصلِ گل آکے گئی میں نے تماشا نہ کیا
چشم بینا وہ مصیبت ہے کہ اے دیدۂ کور   اس کا احسان کہ اس نے تجھے بینا نہ کیا
شکر کر تجھ میں کچھ احساس ہے بایں ہمہ شوق   شکر کر شکر تجھے عشق نے اندھا نہ کیا
غمِ جاناں بھی ترا فیض تھا لیکن دل نے   اس کا اقرار کبھی اے غمِ دنیا نہ کیا
اے مسافر ترے ماتھے پہ شکن آ ہی گئی   تو نے اک خار بھی تلوے میں گوارا نہ کیا
تجھ سے ناموسِ محبت کو یہ شکوہ ہے جمیلؔ
کہ تجھے شدتِ جذبات نے گونگا نہ کیا

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم، تو دم نکل جائے آدمی کا

بس ایک احساسِ نارسائی، نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو
جنوں پہ حالت ربودگی کی، خرد پہ عالم غنودگی کا

ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجھا ہوا ہے چراغِ منزل
کہیں سرِ راہ یہ مسافر، پٹک نہ دے بوجھ زندگی کا

خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں، یہی نہ معنی ہے اس کے واعظ

وہ ابر کا منتظر کھڑا ہو، مکان جلتا ہو جب کسی کی
وہ لاکھ جھکوالے سر کو میرے، مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا
کہ کبریائی سے بھی زیادہ، مزاج نازک ہے بندگی کا

جمیلؔ حیرت میں ہے زمانہ، مرے تغزل کی مفلسی پر
نہ جذبۂ اجتبائے رضوی، نہ کیف پرویز شاہدی کا

۞

یہ قبائے کہنہ اتار دو نہ سبک ہو چشم نیاز میں
کہ جگہ جگہ سے ہے کہنگی کا اثر لباس مجاز میں

ہے پھر اک سَحر کی ہماہمی تپ وتاب سینۂ راز میں
دلِ شب ابھی سے دھڑک رہا ہے سکوتِ شام حجاز میں

کسی سنگ راہ نے یہ کہا کہ سن اے مسافر زندگی
ترے پائے شوق کی عافیت ہے اسی نشیب وفراز میں

ارے نالۂ دل بیکساں تو پیمبروں کی دعا نہیں
سرِعرش تیری جگہ کہاں، اتر آ قلوبِ گداز میں

جو یہی مزاج ہے حسن کا تو کسے ہو عشق کا حوصلہ
نظر آ رہا ہے کسی کا دل مجھے شمع تیرے گداز میں

یہ خودی کہ عارض مہوشاں میں بھی محو خودنگری رہا
مرا آئینہ کہ رچا ہوا تھا، مذاقِ آئینہ ساز میں

ترے گیسوؤں کی داستاں پہ نہیں ہے ختم یہ داستاں
کہ جنوں کے اور بھی ہیں سلسلے ہوس کی عمرِ دراز میں

نہ فروغ حسن ہے مضمحل، نہ مزاج عشق ہے معتدل
وہی ایک شورش آب وگل کہیں سوز میں کہیں ساز میں

ہے فروغ روئے ایاز سے تپ وتاب سینۂ غزنوی
تپ وتاب سینۂ غزنوی کی لہک ہے روئے ایاز میں

ہیں نظامِ شام وسحر میں بھی اسی کشمکش کی علامتیں
جو حجاب ونور کی کشمکش ہے ضمیر ناز و نیاز میں

۞

اضطرابِ خودنمائی کو حیا سمجھا تھا میں
وہ نگاہِ ناز کیا کہتی تھی کیا سمجھا تھا میں

زندگی کے دام لاکھوں تھے مگر ہر دام کو
تیری زلفِ خَم بہ خَم کا سلسلہ سمجھا تھا میں

ایک طاقت تھی جو مجھ سے لے رہی تھی اپنا کام
مدعا کو اس کے اپنا مدعا سمجھا تھا میں

تھی وہ شاید اپنی ہی بیچارگی کی اک پکار
جس کو اپنی سادہ لوحی سے خدا سمجھا تھا میں

اک قناعت تھی کہ تھا جس پر محبت کا گماں
شوق کی افسردہ حالی کو وفا سمجھا تھا میں

بس کہ اک خواہش میں گم تھا اپنی ہستی کا شعور
اور اس خواہش کو ترک مدعا سمجھا تھا میں

وائے محرومی کہ آواز درا نکلی جمیلؔ
جس کو اک درماندہ رہرو کی صدا[1] سمجھا تھا میں

---

1 بہار اردو اکادمی سے شائع فکر جمیل (2003) میں یہاں 'صدا' کے بجائے 'ضد' لکھا ہے، جو کہ غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

۞

ہستی ہے جدائی سے اس کی، جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا میں نہ تھا تو قطرہ تھا، دریا میں ملا تو کچھ بھی نہیں

اک شمع جلی تو محفل میں ہر سمت اجالا پھیل گیا
قانون یہی ہے فطرت کا پروانہ جلا تو کچھ بھی نہیں

سیلاب میں تنکے رقصاں تھے، موجوں سے سفینے لرزاں تھے
اک دریا تھا، سو طوفاں تھے، دریا نہ رہا تو کچھ بھی نہیں

اصلیت تھی یا دھوکہ تھا، اک فتنۂ رنگیں برپا تھا
سو جلوے تھے اک پردہ تھا، پردہ نہ رہا تو کچھ بھی نہیں

طوفاں بھی تھا، آندھی بھی تھی، باراں بھی تھا، بجلی بھی تھی
آئی جو گھٹا تو سب کچھ تھا، برسی جو گھٹا تو کچھ بھی نہیں

پھولوں سے چمن آباد بھی تھے دام اپنا لیے صیاد بھی تھے
سب کچھ تھا جمیلؔ اس گلشن میں، بدلی جو ہوا تو کچھ بھی نہیں

۞

ترا حسن بھی بہانہ مرا عشق بھی بہانہ   یہ لطیف استعارے نہ سمجھ سکا زمانہ
میں نثارِ دستِ نازک جو اٹھائے نازِ شانہ   کہ سنور گئیں یہ زلفیں، تو سنور گیا زمانہ
تری زندگی تبسم، مری زندگی تلاطم   مری زندگی حقیقت، تری زندگی فسانہ
تری زلفِ خم بہ خم نے نئے سلسلے نکالے   مری سینہ چاکیوں سے جو بنا مزاجِ شانہ
ترا نازِ کبریائی بھی مقامِ غور میں ہے   کہ گھٹا دیا ہے سجدوں نے وقارِ آستانہ
میں درونِ خانہ آکر بھی لیے ہوں داغ سجدہ   ہے ابھی مری جبیں پر اثرِ برونِ خانہ
کبھی راہ میں نے بدلی تو زمیں کا رقص بدلا
کبھی سانس لی ٹھہر کر تو ٹھہر گیا زمانہ

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیرگی سے مجھے   ڈرا دیا ہے پتنگوں نے روشنی سے مجھے
سفینہ شوق کا اب کے جو ڈوب کر ابھرا   نکال لے گیا دریائے بیخودی سے مجھے
ہے میری آنکھ میں اب تک وہی سفر کا غبار   ملا جو راہ میں صحرائے آگہی سے مجھے
خرد انہی سے بناتی ہے رہبری کا مزاج   یہ تجربے جو میسر ہیں گمرہی سے مجھے
ابھی تو پاؤں سے کانٹے نکالتا ہوں میں   ابھی نکال نہ گلزارِ زندگی سے مجھے
زبان حال سے کہتا ہے نازِ عشوہ گری   حیا چھپا نہ سکی چشمِ مظہری سے مجھے
برائے دادِ سخن کاسۂ سوال ہو دل
خدا بچائے جمیؔل اس گداگری سے مجھے

برسات کا موسم ہے گھٹا جھوم رہی ہے   میخانے پہ رندوں کی دعا جھوم رہی ہے
بکھرا دیئے کس نے یہ مہکتے ہوئے گیسو   مستوں کی طرح بادِصبا جھوم رہی ہے
اک شاعرِ پیمانہ بکف کیوں نہ ہو بیخود   ان کی نگۂ ہوش ربا جھوم رہی ہے
موسیقیٔ موسم سے ذرا سُر تو ملا آج   تسبیح تری مردِ خدا جھوم رہی ہے

سجدے میں جمیل آگیا یہ کس کا تصور
ہونٹوں پہ نمازی کے دعا جھوم رہی ہے

پردہ حائل جو تھا کہاں ہے اب   تیرا جلوہ ہی درمیاں ہے اب
شمع کہتی رہی جسے شب بھر   خاتمے پر وہ داستاں ہے اب
میری نظروں کی اک تھکن کے سوا   اور کیا چیز آسماں ہے اب
صبر کا میرے امتحاں تو ہوا   تیری رحمت کا امتحاں ہے اب
تو بھی میری طرح نہ ہو ناکام   فکر یہ ربِّ دوجہاں ہے اب
کامیابی کے گر بتانے لگی   عشق پر عقل مہرباں ہے اب
مظہرؔی پیش کارواں تھا کبھی
مظہرؔی گرد کارواں ہے اب

اور کچھ لفظ گڑھو صنعتِ ایہام غلط   ہے یہ خود اپنی خودی اس کا خدا نام غلط
جنبشیں اس کی غلط ہیں کہ خود ابرو میں ہے خم   اس کی تعمیل میں یہ گردشِ ایام غلط
یہ سفر کیا کہ جہاں چھاؤں ملی بیٹھ گئے   دھوپ کتنی ہی کڑی ہو مگر آرام غلط
ہوسِ دانہ اگر ہے تو سوئے دام چلو   ہوسِ دانہ و اندیشۂ دام غلط
اس سے بہتر تھی کہیں گوشۂ آرام میں نیند   یہ سفر کیا کہ ہر اک راہ، ہر اک گام غلط
نہیں افسوں ہی کو افسانے کی منزل معلوم   غلط آغاز کا ہوتا ہی ہے انجام غلط
مظہرؔی چل نہ سکے وقتِ سبک گام کے ساتھ
ہمسفر پیرویٔ وقت سبک گام غلط

بلاؤ اس کو زبان داں جو مظہرؔی کا ہو   مگر ہے شرط کہ اکیسویں صدی کا ہو

یقیں وہی ہے جو آغوش تیرگی میں ملے سوادِ وہم میں ہمسایہ روشنی کا ہو
بتوں کو توڑ کے ایسا خدا بنانا کیا بتوں کی طرح جو ہم شکل آدمی کا ہو
مرا غرور نہ کیوں ہو سرور سے خالی جب اس کے بھیس میں اک چور کمتری کا ہو
بہت بجا ہے یہ مذہب کی موت پر ماتم مگر کوئی تو عزادار شاعری کا ہو
ہے وقت وہ کہ مسلم ہو آذری اس کی
صنم کدوں میں صنم ذہن مظہریؔ کا ہو

الجھی تھی زلف، اس نے سنوارا سنور گئی شانے کو کیا خبر یہ بلا کس کے سر گئی
آئینے بھی بنائے تو دیکھا نہ اپنا منھ اب تک نہ خد و خال پہ اپنے نظر گئی
یوں تو رواقِ دولت و دیں بھی تھے سایہ دار لیکن تھکن غریب کی سوئے شجر گئی
اہل نظر نہ مجھ پہ ہنسیں، میری یہ نظر کچھ تو برونِ حلقۂ حدِّنظر گئی
رستے میں کیا دھرا تھا کہ رکتی کہیں نگاہ دیکھا تمھیں تو عمر گریزاں ٹھہر گئی
اونچی ہوئی فغاں تو گئی آسماں کے پار اترا جو عرش سے تو دلوں میں اتر گئی
منزل تو اپنی حدِ نظر ہی پہ تھی جمیلؔ
پہنچے وہاں تو اور کچھ آگے نظر گئی

یہاں جو بھی تھا تنہا تھا یہاں جو بھی ہے تنہا ہے یہ دنیا ہے یہ دنیا ہے اسی کا نام دنیا ہے
نہ بولا ان سے جاتا ہے نہ دیکھا ان سے جاتا ہے یہاں گونگوں کی بستی ہے یہاں اندھوں کا پہرا ہے
وہ منزل تھی تحیر کی یہ منزل ہے تفکر کی وہاں پردہ بھی جلوہ تھا یہاں جلوہ بھی پردا ہے
وہ عالم تھا تعیّن کا وہاں پردہ ہی پردہ تھا یہ عالم ہے تیقّن کا یہاں جلوا ہی جلوا ہے
سبھی مجروح ہیں اس صیدگاہِ عیش وحرماں میں کسی کا زخم اوچھا ہے کسی کا زخم گہرا ہے
جو وہ اک خوش خیالی تھی تو یہ اک کم نگاہی ہے نہ وہ پھولوں کا گلشن تھا نہ یہ کانٹوں کا صحرا ہے
وہ اہل قال کی مجلس یہ اہل حال کی مجلس وہاں جو کچھ تھا ماضی تھا یہاں جو کچھ ہے فردا ہے

یہ ندّی تو نہیں جو آب شیریں دے سکے تم کو ہے پانی اتنا ہی نمکیں سمندر جتنا گہرا ہے
یہاں ترشے ہوئے لفظوں کا سکہ چل نہیں سکتا یہ بازارِ معانی ہے یہاں موتی بھی قطرا ہے
جمیلؔ آنکھوں کے پٹ کھولو اسے بھی اک نظر تولو
وہ نیرنگِ تصور تھا یہ نیرنگِ تماشا ہے

کچھ بھی نہیں ہے عالمِ ذرّات سے آگے اک عالمِ ہو عالمِ اصوات سے آگے
ملتے ہیں سماوات سماوات سے آگے ہرگام حجابات حجابات سے آگے
اس دہر میں ہم خود بھی ہیں منجملہ خرافات کس طرح نظر جائے خرافات سے آگے
اے رات کے مارو تمھیں کس طرح سمجھاؤں اک صبح بھی اک دن بھی ہے اس رات سے آگے
انساں ہیں مگر بیچ کی منزل میں کھڑے ہیں حیوان سے پیچھے ہیں جمادات سے آگے
جو کچھ ہے یہاں وہ ہے خرابات کے اندر کچھ بھی نہیں اے رند خرابات سے آگے
کیا سوچتے ہو ذہن میں وہ آ نہیں سکتا کیا سوچتے ہو، ہے وہ خیالات سے آگے
ہونے کو وہ جیسا بھی ہو، ہم ہیں تو وہ ہوگا خاموشی ہی خاموشی ہے اس بات سے آگے
سمجھیں گے وہی ذہن جمیلؔ اپنے سخن کو
جاتی ہے نظر جن کی طبیعات سے آگے

برسات کا موسم ہے گھٹا جھوم رہی ہے میخانے پہ رندوں کی دعا جھوم رہی ہے
بکھرا دیئے کس نے یہ مہکتے ہوئے گیسو مستوں کی طرح بادصبا جھوم رہی ہے
اک شاعرِ پیمانہ بکف کیوں نہ ہو بیخود ان کی نگۂ ہوش ربا جھوم رہی ہے
موسیقیٔ موسم سے ذرا سر تو ملا آج تسبیح تری مردِ خدا جھوم رہی ہے
سجدے میں جمیل آگیا یہ کس کا تصور
ہونٹوں پہ نمازی کے دعا جھوم رہی ہے

شامِ غریباں

1963

(جنابِ زینبؑ کے حوالے سے)

شاعری بحرِ معانی کا تلاطم ہے جمیلؔ   جس میں غلطاں ہیں ستارے یہ وہ قلزم ہے جمیلؔ
رنگ و بو کے جو کنایوں میں خرد گم ہے جمیلؔ   شاعری اس پہ حقیقت کا تبسم ہے جمیلؔ
اہلِ دانش ہے وہی اہلِ بصائر ہے وہی
اس تبسم کو جو پہچان لے شاعر ہے وہی

شوق ابھی حیرتیِ شمس و قمر ہے اے دوست   ابھی پردے کے اسی پار نظر ہے اے دوست
کتنا مشکل یہ بصیرت کا سفر ہے اے دوست   جس میں ہر گام پہ منزل کا خطر ہے اے دوست
اس میں منزل کا گماں راہزنی کرتا ہے
رہبری جذبۂ حب الوطنی کرتا ہے

اِس کو جانا ہے حجاباتِ توہّم سے پرے   اس نہاں خانۂ اصوات و تکلّم سے پرے
ظلمت و نور کے خاموش تلاطم سے پرے   وطن اس کا ہے دیارِ مہ و انجم سے پرے
سرِراہے جو اسے بوئے وطن آتی ہے
آنکھ بے ساختہ تخئیل کی کھل جاتی ہے

چشمِ حیراں کو تو دے دیتا ہے جلوہ بھی فریب   رنگ و نیرنگِ مناظر کا تماشہ بھی فریب
بحرِ عرفانِ تجلی کا دھندلکا بھی فریب   اور تخلیقِ مضامیں کا یہ نشّہ بھی فریب
کیفیت اس کی جو تا فکر و نظر پھیلی ہو
کیوں نہ پھر لیلیِ معنی کی ردا میلی ہو

نکتہ بینی ہی نہیں فلسفہ رانی بھی حجاب   استعارات و علاماتِ بیانی بھی حجاب
دانش و دیں کے روایاتِ گمانی بھی حجاب   یعنی الفاظ تو الفاظ معانی بھی حجاب
اِن حجابوں کو جو اُلٹے وہی جلوہ دیکھے
وہی جلوے کی حقیقت کو سراپا دیکھے

ہو اسالیب کی جدت سے جو معنی کا زوال   شاعری پھر تو ہو اک شعبدۂ قال و مقال
اُس سے کہہ دو جو ہے گم گشتۂ صحرائے خیال   کہ ترا ذوق ہے نا محرمِ لیلائے جمال
رنگ و نکہت نے حجاب اپنا اُٹھایا ہی نہیں
حسنِ بے پردہ ترے سامنے آیا ہی نہیں

مجھ کو تسلیم ہے الفاظ کی دارائی بھی   دے اگر دیدۂ ادراک کو بینائی بھی
اس کی تاثیر میں شدت بھی ہو گیرائی بھی   اس میں وسعت بھی ہو رفعت بھی ہو گہرائی بھی
شاعری کیا جو سخن ولولہ انگیز نہ ہو
ہاں مگر خوانِ تکلم میں نمک تیز نہ ہو

بوئے گل زورِ خطابت سے بگولا نہ بنے   داغ پیشانی کا خالِ رُخِ زیبا نہ بنے
نالہ آہنگ میں نالہ رہے نغمہ نہ بنے   نغمہ شوریدگیِ لحن سے نالہ نہ بنے
لفظ و معنی میں توازن ہو سُر اونچا نہ اُٹھے!
آنچ جذبات کی دھیمی رہے شعلہ نہ اُٹھے!

کھول میخانے کا در آ مئے کوثر لے کر   روحِ اسلام کا کھینچا ہوا جوہر لے کر
جس میں سو بحرِ معانی ہیں وہ ساغر لے کر   آج اُٹھوں گا میں ظرفِ دلِ بوذر لے کر
تیری مرضی ہو تو قطرے میں سمندر آجائے
میرے کوزے میں چھلکتا ہوا کوثر آجائے

میرے وجدانِ تفکر کو اچھال اے ساقی   لا مرے دل کی صراحی میں اُبال اے ساقی
دے مرے صیدِ نظر کو پر و بال اے ساقی   دامِ الفاظ و معانی سے نکال اے ساقی
بھیج دے مجھ کو مری حدِّ نظر سے آگے

اِس تبسّم کدۂ برق و شرر سے آگے

اس سفر سے جو پھروں دیدۂ بینا لے کر   نکہتِ گیسوئے الہام کا سودا لے کر
شہپرِ بلبلِ شیراز کا خامہ لے کر   سینۂ وحی سے سوزِ دلِ عیسےٰ لے کر
شمعیں روشن کروں ماضی کے شبستانوں میں
دوں اذاں جاکے تخیل کے صنم خانوں میں

میں فدا بخششِ ساقی ترے اس بادل کے   جس سے صحرائے تقدس میں بھی دریا چھلکے
گئی مے خانے میں فردوس سے مے ڈھل ڈھل کے   پیئے حوروں نے پیالے ترے ہلکے ہلکے
اک گلابی سی گھٹا عرش تلک چھانے لگی
ڈورے آنکھوں کے شہابی ہوئے نیند آنے لگی

آگیا ذکرِ شہیدانِ محبت ساقی   اب سبو کی ہے نہ ساغر کی ضرورت ساقی
اب نگاہوں میں ہے اِک وادیٔ غربت ساقی   دیکھ اک تشنہ دہانوں کی جماعت ساقی
بھول کر خستگی و تشنہ دہانی اپنی
خوں سے لکھتی ہے لبِ نہر کہانی اپنی

اے خردِ وقت کی آشفتہ بیانی سن لے   کیوں گلابی ہوا اس نہر کا پانی سن لے
کارزارِ حق و باطل کی کہانی سن لے   خوں سے تر ریگِ بیاباں کی زبانی سُن لے
پہنچے اس دشت میں اللہ کے دیوانے چند
پہنچے اور دے دیئے تاریخ کو افسانے چند

امتحاں عشق کا تھا عشق کے بندے نکلے   اُن کی تیغوں سے لپکتے ہوئے شعلے نکلے
ماں کے ہاتھوں سے کفن باندھ کے بچے نکلے   پشتیں سیدھی کیے تنتے ہوئے بوڑھے نکلے
ہنس کے طے مرحلۂ تیغ و گلو کرنے لگے
دی جو قرنا نے اذاں خوں سے وضو کرنے لگے

(نامکمل)

مثنوی آب وسراب

اے ہم سفرو کہو خدا را   اس دشت کا ہے کہیں کنارہ
یہ سطحِ غریب زیرِ افلاک   شورش کدۂ عناصرِ خاک
اللہ یہ ہولناک صحرا   کیا دے گا سوائے خاکِ صحرا
ہر کوہ ہے خامشی مجسّم   ہر شاخِ شجر ہے دستِ ماتم
حیرت مری پوچھتی ہے سب سے   خاموش کھڑے ہوئے ہو کب سے
لیکن ساری فضا ہے خاموش   اشجار ہیں چپ ہوا ہے خاموش
ششدر ہیں طیور کی نگاہیں   بھرتی ہے نسیمِ صبح آہیں
حیراں ہیں نجوم آسماں پر   لائی ہمیں زندگی کہاں پر
بے آب و گیاہ ہے یہ صحرا   بے چشمہ و چاہ ہے یہ صحرا
دریا ہے توریت میں چھپا ہے   چشمہ تو تھک کے سوگیا ہے
لو چلتی ہے کارواں ہیں پیاسے   بچے پیاسے جوان ہیں پیاسے
پژمردہ ہے پیری و جوانی
تاحدِّ نظر نہیں ہے پانی

اے مطرب بزم آشنائی   ماتم خانہ ہے یہ خدائی
ماتم ہے کرانہ تا کرانہ   چھیڑ آب و سراب کا ترانہ
پیاسوں کا ہجوم فوج در فوج   دریائے سراب موج در موج
سن لے مری طبعِ مضمحل کی   نغموں سے بجھا دے پیاس دل کی

تو بھی پیاسا ہے اور ہم بھی   پیاسا ہے ستار بھی قلم بھی
یہ کارگہِ زیاں پرستی   ریگ اور سراب کی ہے بستی
نفرت ہو یہاں کہ ہو محبت   دونوں پہ ہے تشنگی کی حالت
ہر جذبۂ ناصبور پیاسا   دانش پیاسی، شعور پیاسا
مزدوری و بندگی بھی پیاسی   دارائی و خواجگی بھی پیاسی
پیاسا ہے جنون بھی خرد بھی   پیاسا ہے غرور بھی حسد بھی
حق یہ ہے کہ دوستی بھی پیاسی   حد یہ ہے کہ دشمنی بھی پیاسی
جلوے پیاسے، نگاہ پیاسی   حیرت بالائے چاہ پیاسی
کچھ شوق کنارِ جو بھی پیاسے   کچھ لب بہ لبِ سبو بھی پیاسے
ہر موجِ حیات کی زبانی   اِک تشنہ لبی کی سو کہانی
تاریخ ہماری اور کیا ہے   اس تشنہ لبی کا مرثیہ ہے
ہر ساز میں اک تپش نہانی   موسیقی اسی کی نوحہ خوانی
فریاد یہی ہے بانسری کی   آواز یہی ہے شاعری کی
ہر دل میں اِک آگ بے بجھائی
افسانوں میں بھی یہی دُہائی

بے شک جو لوگ کم نظر تھے   دریا کی صفت سے بے خبر تھے
نامحرمِ جلوۂ معانی   سمجھا کیے ریت ہی کو پانی
لیکن جو تھے رازدان و عارف   جویائے حقائق و معارف
جن کا پندارِ تشنہ کامی   کرتا رہا نفس کی غلامی
جن کی ساری حیات موہوم   اِک لطفِ سراب سے بھی محروم
ان کی محرومیاں نہ پوچھو   ان کا حسنِ گماں نہ پوچھو
اللہ رے ان کی سرگرانی   قسمت سے کہیں ملا جو پانی

پانی کو بھی وہ سراب سمجھے   جلوہ تھا مگر نقاب سمجھے
پانی سے بھی جو کنارہ کش ہوں   اور وہ جو سراب ہی پہ غش ہوں
دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے
انجام غرض کہ تشنگی ہے

تم سے پہلے یہ کوہ و دریا   خاموش سوال تھے سراپا
ہم کیا ہیں کبھی یہ سوچتے تھے   اشجار اُداس چپ کھڑے تھے
تم آئے تو برگ و بار آیا   صحرا پہ بھی اک نکھار آیا
سبزے کی ادا بھی لہلہائی   پھولوں نے بھی انجمن سجائی
غنچوں نے چٹک کے منھ جو کھولا   گھونگھٹ سے غرورِ حسن بولا
ذرّوں میں خروشِ بے خروشی   جنگل میں غزل سراخموشی
تعظیم کو روحِ دہر اُٹھی   دریا کے بھی دل سے لہر اُٹھی
تم نے ان سب کو نام بخشا   بے ربطی کو اِک نظام بخشا
چونکا جو شعورِ حکمرانی   کی فرض نے روح پر گرانی
ہر آرزو بن گئی ارادہ   وجدانِ عمل ہوا زیادہ
احساس نے بال و پر نکالے   سانچے نئے زندگی نے ڈھالے
تیور پہ ہوا جلال صدقے   ہونے لگے ماہ و سال صدقے
ہموار کیا زمیں کا سینہ   مٹی نے اُگل دیا دفینہ
کہسارِ رفیع کو بھی ناپا   صحرائے وسیع کو بھی ناپا
پہنائی دور کو بھی روندا   دریا کے غرور کو بھی روندا
سینوں کو پہاڑ کے کیا چاک   سیلاب کے منھ میں جھونک دی خاک
ویرانے میں باغ لہلہائے
ظلمت پہ چراغ مسکرائے

مثنوی 'از جہنم'

آغاز کتاب

اسی رب الارباب کے نام سے   جو برتر مذاہب کے اوہام سے
وہ خلاق، وہ احسن الخالقین   جو ہے خالقِ رحمت العالمین
جو گوتم کا، کرشن کا، موسیٰ کا رب   جو زرتشت کا رب، مسیحا کا رب
جو کنفیوشسِ نکتہ رس کا خدا   جو سقراط اور سائرس کا خدا
جوہر نورہر روشنی کا خدا   فلاطوں کا رب اور علیؑ کا خدا
جو معبود و مسجود اہل سلام
جو نانک کا ہر اور گاندھی کا رام
میں کل رات تھا عالمِ خواب میں   نظر تھی دھندلکوں کے گرداب میں
اندھیرا اجالے سے تھا ہم کنار   تحیر میں کیفیتِ اعتبار
میں حیراں تھا سپنوں کے اس دیس میں   تصور تھا تمثیل کے بھیس میں
مرے ذہن میں تھا جو طغیانِ حشر   نظر آیا آنکھوں کو میدانِ حشر
کھلی تھی عدالت درِ عدل باز   پسِ پردہ تھا عادلِ کارساز
ادھر پیش کاری میں جبریل تھے   اُدھر صف بہ صف اہل تعمیل تھے
کہیں نالۂ مستغیثاں کی دھوم   کہیں خاطیوں، عاصیوں کا ہجوم
یکایک اٹھی جو مری چشمِ فن   دکھائی دیا اک رئیسِ وطن
جھکائے تھا سر نامرادوں کی طرح   فرشتے تھے گھیرے پیادوں کی طرح
سلاسل میں تھے اس کو جکڑے ہوئے   گریباں بچارے کا پکڑے ہوئے
لیے جارہے تھے جہنم کی سمت   نظر اس کی تھی عرش اعظم کی سمت
میرا ہم وطن تھا وہ مخدومِ شہر   اٹھی میرے دل میں ترحم کی لہر

ہوا موجزن لب پہ دریائے نطق   بنی شورش دل تقاضائے نطق
میں شاعر تھا انسانیت کا وکیل   بڑھا جانبِ عرش ربِّ جلیل
کہا یہ جھکا کر جبینِ نیاز   کہ اے خالق دوجہانِ مجاز
دوعالم کے مالک دوعالم کے باپ   ہر آدم کے ہرنسل آدم کے باپ
یہ بوڑھا جو سچ مچ ہے بچا ترا   مزاجاً تھا اک عکس سچا ترا
سراپا خودی و مجسم غرور   بڑا زود حس اور بڑا ہی غیور
مقابل میں اس کے جو ابھرا کوئی   ہوا جس سے اندیشۂ ہم سری
لیا مطلقاً پارا پارا اسے   نہ تھا شرک مطلق گوارا اسے
یہ کوشش تھی اس کی کہ ہوجائے ٹھیک   تری طرح سے وحدہٗ لاشریک
ہے جس طرح تجھ کو عبادت پسند   خوشامد تھی اس کو نہایت پسند
تیری طرح تھا یہ بھی رب الکبار   کمینوں، رذیلوں کا پروردگار
انھیں پر کرم اس کا زرپاش تھا   گدا کوئی مانگے تو قلّاش تھا
تھی یہ بھی بہرحال سنت تری   نہیں ہوتی مفلس پہ رحمت تری
غلط کیا جو یہ مانگتا تھا ادب   حقیروں سے ہے تو بھی سجدہ طلب
تری پیروی کی اطاعت تری   نہ بھولا کبھی یہ عبادت تری
نمازیں تھیں، سجدوں پہ سجدہ بھی تھا   جھکاتا تھا لیکن یہ جھکتا بھی تھا
بلاشبہ و شک یہ مردِ امیر   بہت سنگدل تھا، بہت سخت گیر
مزاج رعایا میں پایا بگاڑ   دیے گاؤں کے گاؤں اس نے اجاڑ
جو سرکش انھیں دیکھا ربِّ ودود   تو دہرا دی تاریخِ عاد و ثمود
بغیر اس کے ممکن نہ تھا انتظام   طبیعت کا قانون ہے انتقام

طبیعت ہے تیری بنائی ہوئی   یہ منطق ہے تیری سکھائی ہوئی
کہ تعزیر فی الجملہ تادیب ہے   نہ یہ ظلم ہے اور نہ تخریب ہے

یہ ملزم ہو کیوں ظلم سے مہتہم　　ہے تو بھی تو مالک مرے منتقم
ستم جس کا تادیب بے کینہ ہو　　جو اوصاف کا تیرے آئینہ ہو
تری طرح جو ہو خوشامد پسند　　جھکی گردنیں جس کو بیجد پسند
تری طرح اپنا ثنا گر ہو جو　　صفاتِ جلالی کا مظہر ہو جو
وہ جائے جہنم میں پروردگار　　یہی کیا ترے عدل کا ہے شعار؟
یہ دوزخ کا ہرگز نہیں مستحق　　بہشت اس کا حق ہے بہشت اس کا حق
مری بحث میں تھی نہ جائے سخن　　عدالت کے ابرو پہ آئی شکن
حقیقت کو لیکن گوارا کیا　　فرشتوں کی جانب اشارا کیا
کہ لے جاؤ ملزم کو سوئے بہشت　　کرو محو سب اس کے اعمال زشت
پھر اک فیصلہ منصفانہ کیا　　مجھے سوئے دوزخ روانہ کیا
یہ تھی میری گستاخیوں کی سزا　　سزا بن گئی میرے حق میں جزا
(نامکمل)

قصیدہ

تضمین

برقصیدۂ غالب درمدح علی ابن ابی طالب علیہ السلام

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام یقیں　　سر بسجدہ نگہ حیرتِ اذعان قریں
عالمِ غور میں سب چپ ہیں مکاں ہو کہ مکیں　　'دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں'

تابہ کے بازیِ طفلانۂ قرطاس و قلم　　لفظ و معنی کی کشاکش میں تخیل کا ہے دم
چہ زماں وچہ مکاں وچہ حدوث وچہ قدم　　'ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں'

حرم و دَیر میں افلاسِ شریعت معلوم　　وادیٔ وہم میں پاکوبیِ حکمت معلوم
اور بے مائیگی لفظِ حقیقت معلوم　　'لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں'

کثرت آرائی نیرنگ تصور وحدت　　آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں جنت
حرف مطلب ہمہ رنگینی الفاظ لغت　　'نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں'

اک تجسّس ہے چہ تشکیک چہ اوہام چہ کفر　　سب اسی سے ہیں چہ تنزیل چہ الہام چہ کفر
چہ صنم سازیٔ افکار چہ اصنام چہ کفر　　'موجِ خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام چہ کفر
کجی یک خط مسطر چہ توہم چہ یقیں'

زُہد اک پیاس ہے پروردہ و زائیدۂ شوق　　گتھیاں نفس کی ہیں جذبۂ پیچیدۂ شوق
بسکہ طاعت ہے خود اک صورتِ سنجیدۂ شوق　　'قبلۂ ابروئے بُت اک رہِ خوابیدۂ شوق
کعبہ و بتکدہ یک محملِ خواب سنگیں'

بندگی جاہ پرستی ہے تملق تعظیم　　سجدہ خودداریِ مسجود کی قیمت ہے قدیم
نہیں جُز عکس خرد آئینہ خلقِ عظیم　　'مثلِ مضمونِ وفا باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقش قدم خاک بہ فرق تمکیں'

عقل مجموعۂ اندیشہ و وہم و وسواس　　علم بے چارگیِ فکر و نظر کا احساس
حسن اِک پیکرِ تخئیل بہ آغوشِ قیاس　　'عشق بے ربطیِ شیرازہ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں'

اک مرض ہے عصبی عشق کے آثار عجیب　　وصل ہے جس کی دوائے عملی، عقل طبیب
اور وفا عادتاً اک جذبۂ پاپوش نصیب　　'کوہ کن گر سنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں'

اپنی آنکھوں کو کہا کرتے ہیں عشق خونریز　　ہو بھی جاتا ہے سخن شدتِ احساس سے تیز
نہ فسوں ہوش رُبا ہے نہ جنوں شورانگیز　　'کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں'

سرِ سودائے محبت ہے نہ ہے حسرتِ جاہ   زندگی نام اسی کا ہے تو انااللہ
یہ خموشی ہے کہ ماتم یہ تبسم ہے کہ آہ   ’نہ تمنا نہ تماشا نہ تحیر نہ نگاہ
گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں‘

ہے مناظر کو یہ شکوہ نہ عبرت ہے نہ ذوق   حسن ہے آنکھ کا پردہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
رائیگاں عشوۂ لیلیٰ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق   ’بیدلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں‘

ہر طرف صورتِ نرگس نگراں ہوں لیکن   قائل معجزۂ اہلِ زباں ہوں لیکن
ناظرِ جلوہ گہ کون و مکاں ہوں لیکن   ’سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سرو برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں‘

فلسفہ اپنا قیاسات کی رَو میں واللہ   نہ بہ فتوائے بصیرت نہ بہ ایمائے نگاہ
خامہ بے باک، زباں شوخ، تخیل گمراہ   ’کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقارو تمکیں‘

مرغِ بے بال یقیں دامِ تخیل کے اسیر!   دور از بامِ معارف تری پروازِ حقیر
متبسم تری کوشش پہ حقائق کا ضمیر   ’نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علیؑ عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں‘

آیتِ صدق و صفا جان و دلِ ختمِ رسل   عبد معبود نما، جان و دلِ ختمِ رسل
پردہ و پردہ کشا جان و دلِ ختمِ رسل   ’مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجاد یقیں‘

وائے وہ دستِ طلب جس سے یہ دامن چھوٹے   جس پہ یہ ابر جھکے وہ دُرِ حکمت لوٹے
کیوں نہ روشن ہو جہاں رخ کی کرن جب پھوٹے   ’کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں‘

فیضِ حیدر کی زمانے میں جو چلتی نہ ہوا   اس چمن میں نہ کوئی غنچۂ خاطر کھلتا
عالمِ وجد میں ہے باغ کا پتّا پتّا   ’فیضِ خُلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں‘

بر سے کچھ دیر کو ابرِ کرم اس کا جس جا   منزل آسودہ ہو خیلِ حشم اس کا جس جا
اس کے ناقے کو بٹھادے خدم اس کا جس جا   ’جلوۂ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہو ناموسِ دوعالم کی امیں‘

اس کا مولد ہو تو پھر شانِ حرم کیوں نہ بڑھے   وہی کعبہ ہے جہاں نقشِ قدم اس کا پڑے
اس کے مرقد پہ نہ کیوں خاکِ نجف فخر کرے   ’نسبتِ نام سے اس کے یہ شرف ہے کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ ناز زمیں‘

اس کی شمشیر کے دامن کی ہے پروردہ قضا   گر پڑا مثلِ شجر جس کو لگی اس کی ہوا
ایک اڑتی سی خبر ہے پرِ جبریلؑ کٹا   ’بُرشِ تیغ کا ہے اس کی جہاں میں چرچا
قطع ہوجائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں‘

نکلے ہم کفر کی وادی سے جو حق نے چاہا   ہے مگر سرحدِ ایماں میں بھی اک چوراہا
دل یہ کہتا ہے کہ اے معنیِ نقشِ طٰہٰ   ’جان پناہا دل و جان فیض رسانا شاہا
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں‘

کیوں نہ حیراں ہوں ترے وصف میں اصحابِ خبر   جس بلندی پہ رسا ہو نہ فرشتوں کی نظر
اس بلندی سے بھی منزل ہے تری بالاتر   ’پائے اقدس کو ترے دوشِ پیمبرؐ منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں‘

بت پرستی نہ سہی پھر بھی طبیعت کا وہ رنگ   تیری چوکھٹ پہ جھکا بن کے محبت کی امنگ
فطرتِ آذریِ عشق سے ممکن نہیں جنگ   ’آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں‘

اے تری مدح ہے سوزِ دلِ اہلِ عرفاں   اسی رشتے سے ہم آہنگ ہیں کفر و ایماں
اسی نسبت سے بیاضِ شعرا ہے قرآں   ’تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں‘

اے ترے نور کا چھینٹا مہ انجم کی ضیا   ساغرِ جُود کا چھلکا ہوا قطرہ دریا
سوچتا یہ ہوں کہ وہ کچھ نہیں جو کچھ کہ کہا   ’کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا
کس سے ہوسکتی ہے آرائشِ فردوس بریں‘

در پہ آیا ہے ترے لے کے غلامی کی سند   فارغ از دیر و حرم بندۂ گمراہِ خرد
خارج از ملت و رد کردۂ درگاہ صمد   ‘جنس بازار معاصی اسداللہ اسدؔ
که سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں’

کیوں مرے ذوقِ سخن پر ہے فرشتوں کو عجب   ہاں مرا ناز غلامی نہیں پابندِ ادب
ناز وہ جس نے نہ دیکھی ہو کبھی چشمِ غضب   ‘جرأتِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بس کہ یقیں’

عشقِ پہنے ہے گلے میں جو غلامی کا طوق   یہ وہ جذبہ ہے جسے جذبۂ طاعت پہ ہے فوق
چشم کو خاکِ قدم سے جو ملے سرمۂ ذوق   ‘طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں’

نشۂ جام ولا طبع کو گردے مہمیز   ذوقِ بینش ہو فزوں نشۂ ادراک ہو تیز
لبِ فریاد بنے جوشِ دلِ شور انگیز   غمِ شبیر میں ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں’

بسکہ مشہور ہے طمّاع گروہِ شعراء   مانگتا ہے ترا شاعر بھی قصیدے کا صلہ
اپنے شاعر کو عطا کر سرِ سودائے وفا   دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

شوق دیتا ہے بہت عرضِ مطالب کو طول   لیکن اے دستِ خدا قوتِ بازوئے رسولؐ
مختصر یہ کہ بحقِّ اَب و اَبنائے بتولؑ   ‘دے دعا کو مرے وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں’

مجھ کو دیکھے نظرِ شعلہ و دودِ دوزخ   میں بھی دیکھوں جگرِ شعلہ و دودِ دوزخ
مجھ کو کیا ہو خبرِ شعلہ و دودِ دوزخ   ‘صرفِ اعدا اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوس بریں’

طوائف کی ضرورت متمدن دنیا میں

(ایک زندہ دل فلسفی کے قلم سے)

طوائف کیا ہے؟ تہذیب کی پیشانی پر ایک خوشنما داغ، تمدن کے شفاف چہرہ پر ایک خال سیاہ شبستانِ نشاط کی وہ پروانہ نواز شمع جس نے جلنا نہیں سیکھا صرف جلانا جانتی ہے..... یہ ہے ایک زندہ دل فلسفی کا شاعرانہ تخیل۔ مگر آپ تو پوچھتے ہیں اس کی ہستی کی علت غائی یعنی متمدن دنیا میں اس کے وجود کی احتیاج۔ یہ سوال اگر آپ واقعی پوچھنا چاہتے ہیں تو ہندوستان کے نیم غلامانہ اور نیم مذہبیانہ ذہنیت رکھنے والے رہنماؤں سے نہ پوچھیے، ان سالکین شریعت سے نہ پوچھیے جن کی پاکباز جوانی حجرۂ مسجد میں گناہِ شباب کو ترستے گزری اور معاشرتی مجبوریوں کی بنا پر ’عصمتِ نفس‘ کا ثواب مفت حاصل ہوا۔ اس سوال کا جواب یقیناً مذہبیانہ سطح فکر سے بلند ہے اس لیے پوچھیے ’مغرب‘ کے ان آزاد دماغوں سے جو حقیقت کو مذہبی توجیہات سے الگ کر کے دیکھنے کے عادی ہیں۔ پوچھیے فرانس کے انقلابی مفکر روشو سے، پوچھیے جرمنی کے مشہور فلسفی نیٹشے سے اور اگر آپ ان میں سے کسی سے بھی پوچھنا نہیں چاہتے تو پوچھیے اپنے ملک کے ان بدقسمت نوجوانوں سے جن کے قوائے فطرت قبل از وقت جواب دے چکے ہوں..... ان کا رندھا ہوا دل، ستا ہوا چہرہ، کمہلائی ہوئی جوانی آپ کو زبانِ حال سے بہت کچھ سمجھا دے گی.....

جوان یورپ کی معاشرتی فضا میں جہاں فلسفۂ جذبات کی عملی شرح کی جارہی ہے کسی ایسے مخصوص طبقے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ ان کی سوسائٹی میں آزادانہ طور پر مرد عورت کو باہمی تبادلۂ جذبات کے مواقع حاصل ہیں اِن کے صحیفۂ عیش میں ’عصمت‘ غالب کے ’حرف وفا‘ کی طرح ایک ایسا مہمل لفظ ہے جو کبھی ’شرمندۂ معنیٰ‘ نہ ہوا لیکن آپ کا ’بوڑھا ایشیا‘ جس نے ہماری جذباتی زندگی پر مذہب کا پہرہ رکھا ہے ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ اپنی دخترانِ مریم کو ’کیوپڈ کی بہنوں‘ کی طرح سوسائٹی کی شاعرانہ فضا میں ’ذوق نظر‘ کی پیاس بجھانے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ پس ہمارے آپ کے لیے بجز اس کے دوسری کون سی صورت ہے کہ بیرون حصہ زندگی میں نشاطِ فکر کے لیے، کسب جذبات کے لیے، فریب سکون کے لیے رنگ و بو کی ایک ایسی دنیا بنائیں جسے توڑ ڈالنا ہر وقت ممکن ہو۔ خفا نہ ہو جائیے گا۔ جوانوں کے

لیے جذبات کا لحاظ جب آپ کے مذہب نے رکھا ہے تو پھر آپ کیوں اتنی بے اعتنائی روا رکھتے ہیں۔ گستاخی معاف یا تو چلمن کی تیلیاں توڑ ڈالیے..... 'حسنِ مقید، اور 'چشم عاجز' دونوں کو آزادی دیجیے یا اس 'شمع مجاز' کو روشن کیجیے، کیونکہ پروانوں کی زندگی کے لیے تھوڑے سے سوز کی بہرحال ضرورت ہے۔ ورنہ ملک میں کم از کم شاعروں کی پیداوار تو یقیناً بند ہو جائے گی۔

فلسفیانہ نقطۂ خیال سے نظام عالم میں نیکی کی بقا کے لیے بدی کا وجود ناگزیر ہے۔ دنیا میں بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو نیکی کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ عشق ایک گمراہ جذبۂ انسانی ہے۔ اسے گمراہ ہونے دیجیے کیونکہ صوفیانِ کرام کی نظر میں یہی گمراہی خود 'نوید منزل' ہے۔ بیشک طوائفیں آپ کی سوسائٹی کے جسم میں کیڑوں کی طرح پھیل گئی ہیں۔ آپ قانونی آپریشن کے ذریعے سے اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں، شوق سے کیجیے۔ بلکہ اگر ممکن ہو تو ان زہریلے پھوڑوں کو ہمیشہ کے لیے کاٹ کر پھینک دیجیے۔ لیکن قبل کسی عملی اقدام کے یہ غور کر لیجیے کہ آج جبکہ اسلامی ازم سے کنیزوں کی رسم حکیمانہ اٹھ گئی ہے، متعہ کا فلسفہ رسوا ہو چکا ہے۔ تعدد ازدواج کی 'مذہبی عیاشی' کو زمانے کا رجحان طبع حرام سمجھ رہا ہے۔ آپ نے اپنے منچلے نوجوانوں کی ''معصوم احتیاجِ فطری کے لیے کون سا معقول سامان کر رکھا ہے۔ فرض کیجیے کہ اگر ان کی سیمابی طبیعتیں مجرمانہ امنگیں، شاعرانہ آرزوئیں جوشِ شباب کی رَو میں حدود فطرت سے باہر نکل گئیں تو اس صورت میں جسمانی اور روحانی حیثیتوں سے نقصان کی مقدار کس قدر رہے۔ عقل کی میزان پر تولیے دونوں گناہوں میں کس کا پلّہ بھاری ہوگا اور جب دو برائیوں میں ایک کا انتخاب ناگریز ہے تو کسے انتخاب کرنا چاہیے؟..... پھر آپ اس تلخ حقیقت سے بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ عورتوں میں آزادی کا جذبہ آئے دن زور پکڑ رہا ہے۔ موجودہ طریقہ تعلیم کے برکات سے ان کی بہت سی چھپی ہوئی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں اور منچلے انشا پردازوں کی فیاضی سے انھیں اپنے پہلوؤں میں سے دل کے وجود کا احساس پیدا ہو چکا ہے۔ پس جب مستقبل قریب میں مہذب دنیا کی ہر عورت اپنی پسند سے اپنا شوہر ڈھونڈ لیا کرے گی تو ان بدقسمت نوجوانوں کا ٹھکانہ کہاں ہوگا، مصورِ فطرت نے جن کا نقشِ وجود کھینچنے میں بخل سے کام لیا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ متمدن ممالک کو ہمیشہ چند ایسی عورتوں کی ضرورت ہے جو سوسائٹی کے اجتماعی مفاد کے لیے اپنے 'نفس' کی آزادانہ تجارت کر سکیں۔ رہی یہ بات کہ انفرادی حیثیت سے اس بازارِ نشاط میں اگر کسی سیٹھ جی کا دیوالہ نکل جائے یا کسی 'نواب صاحب' کا محل نیلام ہو جائے تو میرؔ صاحب' ان حوادث کو قوم کا اجتماعی نقصان نہیں کہہ سکتے بلکہ آج دنیا کی موجودہ سیاست تو اس بات کی مقتضی ہے کہ 'خرمن سرمایہ داری' کے لیے نئی نئی بجلیاں بنائی جائیں۔ پھر آپ کو اس پرانی 'خرمن نواز' بجلی سے کیوں ضد ہے؟ خدا کے لیے کرنے دیجیے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ''دولت مند ہندوستان'' کی شخصی آمدنی فی کس سات پیسہ ہے۔ پھر بتلائیے کہ ایسے فاقہ زدہ ملک میں کروڑ پتی مہاجنوں کی کیا ضرورت ہے۔ بائی جی کی حسین فرمائشوں کے بہانے یہ 'منجمد دولت' اگر ملک میں بکھر جائے تو بہتر ہے۔ اقصادی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو انھیں طوائفوں کے صدقے میں پشتہا پشت کا 'مدفون سرمایہ' اپنی تاریک قبروں سے نکل کر دنیا کی کھلی ہوئی فضا میں سانس لیتا ہے..... یاد رکھیے دولت کی زندگی اسی وقت تک ہے جب تک وہ بازاروں میں دوڑتی پھرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طوائفوں کے 'ذوقِ آرائش' کو سودیشی ہونا چاہیے۔ تاکہ ان کا لوٹا ہوا 'خراجِ حسن' ملک کے غریب مزدوروں تک پہنچ جائے۔ اگر کسی شہر میں کوئی کھدر پوش طوائف ہے تو میرے خیال میں سیاسی رہنماؤں کا یہ قومی فرض ہے کہ وہ موٹے موٹے اسامیوں کو پھانس پھانس کر اس کے کوٹھے تک پہنچائیں۔ اس مقدس دلالی میں دو فائدے ہیں۔ ایک تو غریبوں کو اس 'زکوٰۃ حسن' سے ان ڈائریکٹ (indirect) طور پر مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ دوسرے سرمایہ داروں کا طبقہ جو ملک کی 'حقیقی آزادی' کی راہ میں کانٹوں کی طرح حائل ہے خوبصورتی کے ساتھ سرک جائے گا، معاف کیجیے گا۔ آپ کا ایشیائی تعصب طوائفوں کی قدر کرے یا نہ کرے لیکن اگر ان 'اوپر والیوں' کی قلیل جماعت بھی روس میں ہوتی تو آپ دیکھ لیتے کہ بلا کسی کشت و خون کے اشتراکیت کا مقصد خود بخود پورا ہو جاتا ہے۔ طوائف فطرت کے ہاتھ میں ایک خوبصورت حربۂ انتقام ہے۔ وہ پرغرور سر جس میں غریبوں پر حکومت کرنے کا تند خیال بھرا ہوتا ہے جب کسی حسین 'دختر گناہ' کے مہندی لگے پاؤں سے ٹھکرایا جاتا ہے تو ملکہ فطرت کھل کھلا کر ہنستی ہے..... آپ کا جی چاہے تو آنسو بہائیے۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ اگر آپ غور کریں گے تو میرے اس مجنونانہ فلسفۂ اخلاق میں 'اربابِ ذوق' کے لیے بہت سی گنجائش فکر ملے گی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اس تحریر کو ایک 'عاشقانہ چھیڑ' یا مجذوبانہ مذاق سمجھیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ طوائف کی ضرورت جب ناگزیر ہے تو اس مضمون کو 'طوائف زندہ باد' کے نعروں کے ساتھ ختم کرنا چاہیے۔ فقط

راقم۔ع: وہ خرمن دور سے جو خندہ زن ہے برق رقصاں پر

ختم شد